چاندنی کا سفر

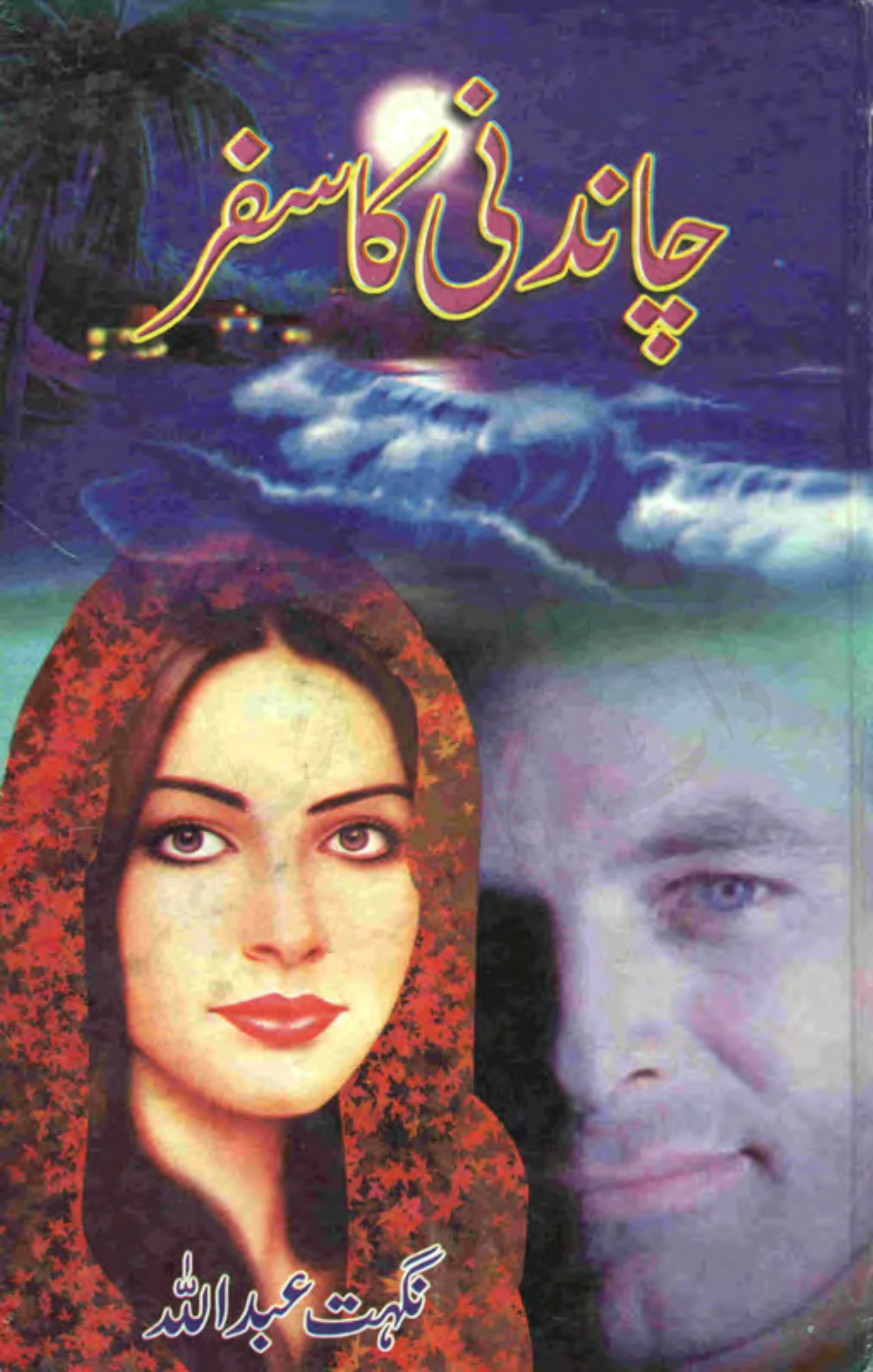

نگہت عبداللہ

عرض ناشر

ساگر پبلشرز کی ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ آپ تک ایسی معیاری، اچھوتی اور نئی قلمی تخلیق اور ادبی کاوش پہنچائی جائے جو زندگی آمیز بھی ہو اور زندگی آموز بھی۔ جو قلب و ذہن کی تسکین کا سامان کرے، جس سے آپ میں عمل و حرکت کا کوئی داعیہ پیدا ہو اور جس سے آپ کے ذوق مطالعہ کی تشنگی کا مداوا ہو۔ اس سلسلہ میں ہمارے ادارہ کے کئی ایک خوبصورت ناول زیور طباعت سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچے اور داد تحسین وصول کی۔ آپ نے انہیں خوب سراہا اور بڑی پذیرائی بخشی۔ یہ آپ کی پسندیدگی کا نتیجہ ہے کہ ہم آپ کے لئے نئی نئی تخلیقات کا اہتمام کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

اپنی اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اب ہم ملک کی ایک معروف خاتون ناول نگار محترمہ نگہت عبداللہ کے سات ناولوں کا ایک دلکش اور مہکتا گلدستہ آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ ان میں ایک حسین ناول ''چاندنی کا سفر'' اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

محترمہ نگہت عبداللہ محتاج تعارف نہیں۔ ناول کی دنیا کا جانا پہچانا نام ہے۔ محترمہ لکھنے میں اپنا خاص اسلوب رکھتی ہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں اس کا حق ادا کر دیتی ہیں۔ یہ ناول بھی آپ کی دلفریب اور نظر افروز تخلیقی کاوش ہے۔ امید ہے ہماری یہ تازہ کاوش بھی پہلے کی طرح جسے ہم دیدہ زیب ٹائٹل اور عمدہ گیٹ اپ کے ساتھ آپ کے خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی اور آپ اسے پذیرائی بخشیں گے۔ اپنی قیمتی آراء سے ضرور مطلع فرمائیں۔

منیجر

ساگر پبلشرز، لاہور

چاندنی کا سفر

؎ نالے لمّی تے نالے کالی

آئینے میں اس کا عکس نظر آیا تو وہ شوخی سے گنگنایا۔ اور دوپٹے پر بیل ٹانکتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو رُکے۔ دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بالوں میں برش کرتے ہوئے اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ اور اونچی آواز میں گانے لگا۔

؎ نالے لمّی تے نالے کالی

وہ سمجھ گئی، اُس کے دراز قد اور کالی رنگت پر چوٹ کر رہا ہے۔ دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے سوچنے لگی۔

''خود تو شہزادہ گلفام ہے جیسے۔ شاید اس سے بھی زیادہ حسین سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ سراسر خوش فہمی!''

''سجو! ذرا بتانا تو میں کیسا لگ رہا ہوں؟'' آئینے کے پاس سے ہٹ کر اُس کے سامنے کھڑا ہو کر پوچھنے لگا تو وہ یونہی سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈارک براؤن پینٹ پر لائٹ

. اون دھاری دار شرٹ میں خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ سلیقے سے بنے بالوں نے صبیح پیشانی کو نمایاں کر دیا تھا۔

''نظر لگانے کا ارادہ ہے؟'' وہ اُسے محویت سے اپنی طرف دیکھتے پا کر شرارت سے بولا تو اُس نے جھینپ کر سر جُھکا لیا۔

''تم نے بتایا نہیں، میں کیسا لگ رہا ہوں۔''

''آئینے میں دیکھ تو چکے ہو، پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اُس نے دامن بچایا۔

''آئینے کو چھوڑو، تم بتاؤ!'' وہ سمجھ گئی۔ وہ اس سے کچھ کہلوائے بغیر پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے جان چھڑانے کی غرض سے بہت عام سے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہی لگ رہے ہو۔''

''اتنے بجھے دل سے کیوں کہہ رہی ہو۔ اس سے اچھا ہے، صاف کہہ دو۔ اچھے نہیں لگ رہے۔''

وہ کچھ کہنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ ممانی جان اُسے پکارتی ہوئی آ گئیں۔

''سرمد! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟''

''بالکل تیار ہوں امی!'' وہ ایڑیوں پر اُن کی طرف گھوم گیا۔

''ماشاءاللہ! چشمِ بددور۔'' ممانی جان بیٹے کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولیں، تو وہ اُسے دیکھ کر گردن اکڑاتے ہوئے بولا۔

''یہی الفاظ تم بھی کہہ دیتیں تو زبان تو نہ گھس جاتی تمہاری۔''

وہ خاموشی سے سر جُھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تو وہ ممانی جان سے کہنے لگا۔

''کیا خیال ہے امی! عجو کو بھی ساتھ نہ لے چلیں؟''

''میں نے تو صبح ہی اس سے کہا تھا لیکن یہ کہیں آنے جانے پر تیار ہی نہیں ہوتی۔''

''چلی چلوناں عجو!'' وہ لگاوٹ سے بولا۔ ''اور کچھ نہیں تو میرے لیے کوئی لڑکی ہی پسند

کر لینا۔''

''یہ کام تم خود ہی کر لینا۔'' وہ اُسی طرح سر جھکائے ہوئے بولی۔

''ظاہر ہے، آخری فیصلہ تو میں خود ہی کروں گا لیکن اگر.....''

''یہ تم کس بحث میں اُلجھ رہے ہو۔ چلو! دیر ہو رہی ہے۔''

ممانی جان نے اُسے ٹوکا، پھر اُسے تقریباً دھکیلتی ہوئی آگے نکل گئیں، تو وہ بہت خاموشی سے سر اُٹھا کر اُن دونوں کو جاتے ہوئے دیکھنے لگی، پھر طویل سانس لے کر دوپٹہ اور بیل لپیٹ کر تھیلے میں رکھا اور اُٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ نانی اماں برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی تھیں، اُسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

''بیٹا! تم بھی اپنی ممانی کے ساتھ چلی جاتیں۔''

''نہیں نانی اماں!'' وہ اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''ممانی جان کے میکے میں شادی ہے۔ اور میں وہاں کسی کو جانتی بھی نہیں۔ خواہ مخواہ بور ہوتی۔''

''بیٹا! آنے جانے سے جان پہچان ہو ہی جاتی ہے۔ تم تو کہیں بھی نہیں نکلتیں۔''

''بس میرا دل نہیں چاہتا۔'' پھر بات بدلنے کی غرض سے بولی۔

''یہ بتایئے! آپ کھانا کس وقت کھائیں گی؟ اگر کہیں تو میں ابھی روٹی ڈال دوں؟''

''ہاں ڈال دو، تمہارے ماموں جان بھی آنے والے ہوں گے۔''

''کیوں! کیا ماموں جان شادی میں نہیں جائیں گے؟'' وہ اُٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''نہیں، صبح منع کر رہے تھے۔ اسی لیے تو تمہاری ممانی چلی گئیں۔ ورنہ اُن کا انتظار کرتیں۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

پھر ابھی وہ روٹی پکا کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ ماموں جان آفس سے آ گئے۔ اُس نے جلدی سے دسترخوان بچھا کر کھانا رکھ دیا۔ اور نانی اماں کے اصرار پر اُن کے ساتھ کھانے میں شریک بھی ہو گئی۔

ممانی جان اور سرمد رات میں بہت دیر سے لوٹے۔ اُس وقت وہ سونے کے لیے اپنی جگہ پر لیٹ چکی تھی۔ لیکن جب سرمد کو کمرے میں آتے دیکھا تو اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ایک نظر اُس پر ڈال کر نانی اماں کے پلنگ پر بیٹھ گیا اور اُن کا کندھا ہلاتے ہوئے بولا۔

''بڑی اماں! اتنی جلدی سو رہی ہیں آپ؟''

''جلدی کہاں، گیارہ سے اُوپر ہو گئے ہیں۔'' نانی اماں غنودگی میں بولیں۔

''بارہ تو نہیں بجے ناں۔ اُٹھ کر بیٹھیں۔ آپ کو شادی کا احوال سناؤں۔''

''یہ احوال تم صبح بھی سنا سکتے ہو۔ انہیں نیند میں سے کیوں اٹھا رہے ہو؟''

وہ ناگواری سے بولی۔ اصل میں وہ خود بھی اس وقت سونا چاہتی تھی اور جانتی تھی کہ اس وقت اگر وہ شادی کا احوال سنانے بیٹھ گیا تو ایک بجے سے پہلے نہیں اُٹھے گا۔

''چلو! انہیں نہیں اُٹھاتا۔'' وہ خلافِ توقع اُس کے اتنی جلدی مان لینے پر حیران ہوئی لیکن جب وہ نانی اماں کے پلنگ سے اُٹھ کر کرسی کھینچ کر اُس کے پلنگ کے قریب بیٹھا تو وہ جلدی سے بولی۔

''میں بھی سونے جا رہی ہوں۔''

''تم سو جاؤ گی تو چائے کون بنائے گا؟''

''یہ چائے کا کون سا وقت ہے!''

''چائے کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ چلو اُٹھو، ہری اَپ۔ بڑی شدید خواہش ہو رہی ہے۔''

وہ اطمینان سے اُس کے پلنگ پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولا تو وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔

''جتنی مرضی گالیاں دے لو۔ میں چائے ضرور بنوں گا۔''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے گالیاں دینے کی۔'' وہ بھناتی ہوئی چادر پھینک کر کھڑی ہو

گئی۔

''سنو! غصہ مت کیا کرو۔ رنگت اور سیاہ پڑ جاتی ہے۔''

وہ اندر تک سُلگ گئی۔ مزید اُس کی مسکراہٹ دل جلا رہی تھی۔ دل چاہا دوبارہ بیٹھ جائے اور چائے بنانے سے صاف انکار کر دے۔ لیکن جانتی تھی وہ اپنا کام کروائے بغیر کسی صورت یہاں سے نہیں ٹلے گا۔ اس لیے دل ہی دل میں اُسے بُرا بھلا کہتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

کچن میں ممانی جان پہلے سے موجود تھیں اُسے دیکھ کر قدرے تعجب سے پوچھنے لگیں۔

''تم ابھی سوئی نہیں بیٹا!''

''سونے ہی جا رہی تھی کہ.....'' وہ رُک گئی۔ لاکھ اُس پر غصہ سہی، اُس کی شکایت نہیں کر سکتی تھی۔

''سرمد نے اُٹھا دیا ہو گا۔''

''نہیں ممانی جان! بس چائے ہی تو بنانی ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''تو نواب صاحب! اب چائے پئیں گے۔ اُس سے کہو، اگر ایسا ہی دل چاہ رہا ہے تو خود بنا لے، تمہیں بے آرام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں بنا دیتی ہوں۔'' اُس نے جلدی سے کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دیا۔

''تم اُسے سر چڑھا رہی ہو بیٹا! آئندہ مشکل ہو جائے گی۔''

ممانی جان نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جلدی سے رُخ موڑ کر ریک پر سے مگ اُٹھانے لگی۔

''اچھا بیٹا! پھر لائٹ بند کر دینا۔''

ممانی جان دودھ کا گلاس لے کر اندر چلی گئیں تو وہ خوشگوار احساس میں گھر کر چائے بنانے لگی، پھر جب وہ چائے لے کر اندر آئی تو سرمد وہاں موجود نہیں تھا۔ اُس نے برآمدے میں نکل کر دیکھا۔ اُس کے کمرے سے ہلکے ہلکے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اُسی طرف چلی آئی۔

دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو وہ لباس تبدیل کر کے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اور ابھی ممانی جان نے بات ایسی کر دی تھی کہ وہ اب براہِ راست اُس کی طرف دیکھ بھی نہ سکی۔ جُھکی پلکوں کے ساتھ بہت خاموشی سے چائے کا مگ ٹیبل پر رکھا اور جانے لگی کہ اُس نے پکار لیا۔ وہ رُک گئی لیکن پلٹ کر نہیں دیکھا۔

''جا کہاں رہی ہو؟ بیٹھو ناں!''

''میں اب سوؤں گی۔'' وہ پلٹ کر دیکھے بغیر بولی۔

''سو جانا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ کم از کم میرے چائے پینے تک تو بیٹھو۔''

وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔ تب اُس نے چائے کا مگ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اور دو تین سپ لینے کے بعد کہنے لگا۔

''پتہ ہے سجو! بڑی خالہ بھی راولپنڈی سے آئی ہوئی تھیں۔''

اس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگا۔

''ان کی بیٹیاں سعدیہ اور نادیہ بھی ساتھ تھیں۔ میں نے ایک عرصے بعد اُنہیں دیکھا ہے۔''

''اور تمہیں افسوس ہو رہا ہوگا کہ اَب سے پہلے اُنہیں کیوں نہ دیکھا۔'' وہ جل کر بولی۔

''واقعی!'' وہ اپنی دُھن میں بولے گیا۔ ''تمہیں کیا بتاؤں، کتنی خوبصورت ہیں دونوں۔ کل یا پرسوں بڑی خالہ یہاں آئیں گی، پھر تم خود ہی دیکھ لینا۔''

''دیکھ لوں گی۔'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ممانی جان کی بات نے جو ایک نیا احساس بخشا تھا وہ اُس کی سنگدلی کی نذر ہو گیا۔ جیسے ہی اُس نے خالی مگ ٹیبل پر رکھا وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''اُفوہ! تم تو جیسے اسی انتظار میں بیٹھی تھیں کہ میں مگ خالی کروں اور تم اُٹھا کر چل دو۔''

''ظاہر ہے۔ مجھے صبح جلدی اُٹھنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں جلدی سوؤں بھی۔''

وہ حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، اُس کے کمرے سے نکل آئی۔

وہ سونے کے لئے لیٹی تو خاصی آزردہ ہو رہی تھی۔ حالانکہ ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا۔ وہ تو اکثر ہی اُس کے سامنے دوسروں کی تعریف اسی طرح کیا کرتا تھا بلکہ اکثر اُس کا مذاق ہی اُڑاتا رہتا ہے۔ پھر بھی پتہ نہیں کیوں وہ اُس سے کچھ اُمیدیں وابستہ کر بیٹھی تھی۔ اس میں غلطی اُس کی نہیں تھی بلکہ نانی اماں اور خود ممانی جان اکثر ایسی باتیں کر جاتیں کہ وہ دل کو اُس کا تمنائی ہونے سے روک نہ سکی بلکہ اُس پر اپنا حق بھی سمجھنے لگی تھی۔ اور پھر یہ کوئی ایک دو دن یا برس دو برس کی بات تو نہیں تھی۔ وہ جب سے یہاں تھی تب سے ہی ایسی باتیں سنتی آ رہی تھی۔

بہت چھوٹی سی تھی جب امی کا انتقال ہو گیا تھا اور جب ابو جی نے دوسری شادی کی۔ اس وقت نانی اماں اور ماموں جان اُسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اُس نے شعور کی سیڑھیاں اسی گھر میں طے کی تھیں۔ اور اس گھر کے مکینوں کو ہی وہ اپنا سب کچھ سمجھتی تھی۔

ظاہر ہے امی اسے یاد نہیں تھیں۔ اور ابو جی نے کبھی پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔ بس کبھی کبھار معمولی سی رقم بھیج کر شاید اپنے ہونے کا احساس دلا دیتے تھے۔ آخری بار اُس نے جب وہ پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی، تب اُنہیں دیکھا تھا۔ وہ کسی کام سے کراچی آئے تھے تو یونہی کھڑے کھڑے اُس سے ملنے چلے آئے تھے۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں آئے۔ شروع شروع میں وہ اُنہیں یاد کرتی تھی۔ اور انتظار بھی کرتی کہ شاید پھر کبھی آئیں لیکن اُس کا انتظار، انتظار ہی رہا اور پھر وقت کی گرد نے بہت کچھ دُھندلا دیا۔

بہر حال، وہ یہاں خوش اور مطمئن تھی۔ نانی اماں اور ماموں جان کے علاوہ ممانی جان بھی اُس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اور ان کی باتوں سے اُس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اُسے اپنی

بہو بنانا چاہتی ہیں۔ پھر وہ کیسے نہ خواب سجاتی۔

لیکن سرمد..... وہ ہمیشہ سے ہی پتہ نہیں جان بوجھ کر یا انجانے میں اُس کے خوابوں کو مسمار کرتا آرہا تھا۔ وہ اب تک اُسے سمجھ نہیں سکی تھی۔ کبھی اتنا مہربان اور کبھی ایک دم سے کٹھور بن جاتا۔ اور وہ نادان لڑکی اُس کی مہربانیوں پر خوش اور اُس کی سنگدلی پر آزردہ ہو جاتی۔ اُس رات بھی وہ بہت دیر تک اُس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

☆☆☆

سرمد کی بڑی خالہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ آئیں تو ممانی جان نے بصد اصرار اُنہیں اپنے پاس روک لیا۔ سعدیہ اور نادیہ کو کراچی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ پہلے بھی وہ یہاں آتو چکی تھیں لیکن اُس وقت بہت چھوٹی تھیں اور بقول اُن کے، اُنہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ دونوں آتے ہی سرمد کے سر ہو گئیں۔

''ہمیں کلفٹن لے چلو۔''

''بیٹا! ابھی تو آئی ہو، کچھ دیر بیٹھو۔ کھانا کھانے کے بعد اطمینان سے جانا۔'' ممانی جان نے کہا تو سعدیہ منہ بنائے ہوئے بولی۔

''خالہ جان! ہم بس چند دنوں کے لیے تو آئے ہیں۔ اور ان چند دنوں میں ہم ڈھنگ سے گھوم پھر بھی نہیں سکیں گے۔ جب تک کھانا تیار ہو گا تب تک تو ہم کلفٹن پہنچ بھی جائیں گے۔ اور رہی کھانے کی بات تو ہم وہاں کچھ بھی کھالیں گے۔''

''اور کیا!'' نادیہ نے بہن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''تمہاری مرضی، میں تو تمہارے بھلے کو کہہ رہی تھی۔''

ممانی جان نے بات اُن کی مرضی پر چھوڑ دی تو نادیہ اُن کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔

''تو خالہ جان! آپ سرمد سے کہیں ناں وہ ہمیں لے جائے۔''

''کیا کہہ رہا ہے وہ؟''

''موصوف کچھ اکڑ رہے ہیں۔''

''میرا خیال ہے، دھوپ کی وجہ سے منع کر رہا ہو گا۔ ٹھہرو! میں پوچھتی ہوں اُس سے۔''

ممانی جان نے وہیں سے سرمد کو آواز دی تو دوسری آواز پر وہ چلا آیا۔

''بھئی دیکھو، یہ سعدیہ اور نادیہ کیا کہہ رہی ہیں۔'' ممانی جان نے کہا تو وہ اُن دونوں بہنوں کو دیکھتا ہوا بولا۔

''یہ دونوں اس وقت کلفٹن جانے کی بات کر رہی ہیں جبکہ میرا خیال ہے.....''

''تم اپنا خیال اپنے پاس رکھو۔ جو یہ دونوں کہہ رہی ہیں وہی کرو۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ کندھے اُچکاتے ہوئے بولا۔

''اگر ان دونوں کو دھوپ میں جلنے کا شوق ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ چلو جلدی کرو۔''

''ہم بالکل تیار ہیں۔ البتہ سجو سے پوچھ لو۔ وہ بھی چلے تو۔'' نادیہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

''وہ کہیں نہیں جاتی۔'' اُسے آتے دیکھ کر کہنے لگا۔

''سجو! ہمارے ساتھ جا کر کیا کرے گی، چلو ہم لوگ چلتے ہیں۔''

اُس نے خاموشی سے اُسے اُن دونوں بہنوں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا، پھر ممانی جان سے کھانے کے بارے میں پوچھ کر کچن میں آ گئی۔

دوپہر میں کھانے کے بعد وہ یونہی کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے نانی اماں کے پاس لیٹ گئی۔ وہ اُس وقت سوتی نہیں تھی۔ اکثر سلائی کڑھائی کا کام اُس وقت کیا کرتی۔ اس وقت بھی اسے دوپٹہ مکمل کرنا تھا۔ اُس نے سوچا کچھ دیر لیٹ کر اُٹھ جائے گی۔ ممانی جان اپنی بہن کے ساتھ پتہ نہیں سو گئی تھیں یا باتوں میں مصروف تھیں۔ اُس نے نانی اماں کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے دیوار پر نظریں جمائے جانے کن سوچوں میں گم تھیں۔

''نانی اماں!'' اُس نے ہلکے سے پکارا تو وہ ہوں کہہ کر اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''آپ کو نیند نہیں آ رہی؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟ روزانہ تو آپ اس وقت سو جاتی ہیں۔''

''ہاں!'' ہاں کی صورت ان کے ہونٹوں سے طویل سانس خارج ہوئی۔ پھر کہنے لگیں۔

''میں سرمد کے بارے میں سوچ رہی ہوں، جوان جہان لڑکیوں کو لے کر اکیلا نکل گیا ہے۔''

''تو کیا ہوا نانی اماں؟'' وہ بظاہر عام سے لہجے میں بولی، ورنہ تو اُسے بھی یہ بات کھٹک رہی تھی۔

''نہیں بیٹا! یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اور ان لڑکیوں کو تو دیکھو، کیسے اُس کے ساتھ چل پڑیں، اماں نے بھی منع نہیں کیا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

''تم کیوں نہیں گئیں اُن کے ساتھ۔''

''ارے!'' وہ ہنس پڑی۔ ''ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں، یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''تم بے وقوف ہو۔'' نانی اماں خجالت مٹانے کو اُسے ڈانٹنے لگیں۔

''تمہیں سرمد کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ ابھی سے اِدھر اُدھر تاک جھانک میں لگ گیا تو۔''

''بس کریں نانی اماں!'' وہ اُلجھ کر بولی۔ ''میرا اُس پر کیا اختیار!''

''ارے واہ! اختیار کیسے نہیں ہے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارے ماموں جان تمہارے بارے میں کیا سوچے ہوئے ہیں۔''

''کک۔ کیا سوچے ہوئے ہیں؟'' وہ بوکھلا کر پوچھنے لگی۔

''وہ تم دونوں کی شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔''

نانی اماں نے اُس کی ٹھوڑی چھو کر اپنے طور پر اُسے خوشخبری دی تھی۔ لیکن وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ نہ دل زور سے دھڑکا نہ کوئی خوشگوار احساس جاگا۔ اس کے برعکس اندر ہی اندر کچھ

ٹوٹتا سا لگ رہا تھا۔

شام میں نہانے کے بعد وہ آنگن میں کھڑی بال سُلجھا رہی تھی، جب وہ تینوں آئے۔ سرمد کے چہرے پر تھکن کے ساتھ کچھ بیزاری کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ چارپائی پر گرنے کے انداز میں بیٹھا اور پھر ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹتے ہوئے بولا۔

''سجو! چائے ملے گی؟'' اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی نادیہ بول پڑی۔

''ہاں بھئی، بڑی شدید خواہش ہو رہی ہے چائے کی۔ ذرا فرسٹ کلاس سی چائے بنانا۔''

''ایسا کرو نادیہ! چائے تم ہی بنا لو۔'' سرمد بالوں میں اُنگلیاں پھنساتا ہوا بولا۔

''میں!!'' وہ یوں چیخی، جیسے اُس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

''کیوں، کیا تمہیں چائے بنانی نہیں آتی؟''

''آتی ہے، لیکن اس وقت سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''اتنی تھک گئی ہوں۔ کچن میں جانے کی بالکل ہمت نہیں۔''

سرمد نے مزید اصرار نہیں کیا تو وہ گیلے بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی باندھ کر کچن میں چلی گئی۔

پھر سعدیہ اور نادیہ دو دن رہیں۔ اور ان دو دنوں میں اُنہوں نے خوب اودھم مچائے رکھا تھا کہ اُن کے جانے کے بعد ایک دم بہت زیادہ خاموشی کا احساس ہونے لگا۔ حالانکہ یہ گھر تو سدا سے ایسا ہی تھا۔ بس دو دن ہنگامہ کیا دیکھ لیا کہ سناٹوں کا احساس ہونے لگا تھا۔

''تم کیسی لڑکی ہو؟''

سرمد کو شاید پہلی بار اُس کے وجود کے گرد کھڑی خاموش دیواروں کا احساس ہوا تھا۔ اس سے اُلجھ پڑا۔

''نہ ہنسنا بولنا، نہ کوئی تفریح، بات کرلو تو مجبوراً جواب دے دیتی ہو، ورنہ خود سے کوئی

بات کرنی سیکھی ہی نہیں۔ مجھے تو تمہارے زندہ ہونے پر شبہ ہونے لگا ہے۔ سچ بتاؤ، تم اُکتاتی نہیں ہو، تمہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ سارا دن ہونٹ سیئے رکھتی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے، سارا دن جو کچھ نہ کچھ سیتی رہتی ہو، تو ان کے ساتھ ساتھ اپنے ہونٹوں کو بھی سی لیا ہے۔'' وہ حیران تھی کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس کی طرف دیکھے گئی۔

''کیا تمہارے دل میں کوئی خواہش نہیں جاگتی؟'' وہ اُس کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''دل یہ نہیں چاہتا کہ اپنی ہمجولیوں میں اُٹھو بیٹھو۔ قہقہے لگاؤ یا نانی اماں کے ساتھ رہ رہ کر اُن کی بوڑھی روح تمہارے اندر بھی سما گئی ہے۔''

''نہیں تو۔'' وہ بے خیالی میں کہہ گئی۔

''کیا نہیں تو۔''

''میرا مطلب ہے، میری کوئی ہمجولی کوئی دوست ہی نہیں، پھر میں کس کے ساتھ.....''

''دوست بنانے سے بنتی ہے۔'' وہ اُس کی بات کاٹ کر بولا۔

''آس پاس کتنی لڑکیاں ہیں، وہ جب بھی آتی ہیں تم اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہو۔ وہ دیواروں سے باتیں کرنے تو نہیں آتیں۔ اور میرا خیال ہے اب تو سب نے آنا بھی چھوڑ دیا ہے۔''

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''سراسر تمہارا قصور ہے۔ ایسی بیزار شکل بنائے رکھتی ہو کہ وہ سمجھتی ہوں گی، تمہیں اُن کا آنا ناگوار گزرتا ہے۔''

''نہیں تو۔''

''پھر وہی، نہیں تو۔''

''آخر تم خفا کیوں ہو رہے ہو؟''

''خفگی کی بات نہیں ہے کیا' کہ تمہاری موجودگی کے باوجود اس گھر کی فضا خاموش اور بے رنگ سی لگتی ہے۔ جبکہ میں نے تو سنا ہے کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔''

قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''سعدیہ اور نادیہ کو نہیں دیکھا۔ کتنی زندہ دل لڑکیاں ہیں۔ دو دن یہاں رہیں، صرف دو دن اور گھر کے در و دیوار تک کھل اُٹھے۔''

''تو سارا قصہ یہ ہے سرمد علی! کہ تم اُن دونوں کے جانے سے اُداس ہو۔'' اُس نے سوچا۔

''کیا تم اُن دونوں جیسی نہیں بن سکتیں؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''نہیں!''

''کیوں؟''

''میں جیسی ہوں، ٹھیک ہوں۔ مجھے اپنی شخصیت پر کسی اور کا رنگ نہیں چڑھانا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر اُس کے پاس سے ہٹ گئی تھی۔

وہ شاید خفا ہو گیا تھا کہ اُس سے بات کرنی ہی چھوڑ دی نہ اپنے کسی کام کے لیے کہتا۔ چائے تک خود بنانے لگا تھا۔ وہ اگر کسی وقت چائے بنا کر لے جاتی تو خاموشی سے کپ تھام لیتا۔ ورنہ تو زبردستی اُسے بھی بٹھا لیتا تھا۔ اور جب تک چائے پیتا، اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اَب نہ وہ شوخی، نہ وہ گنگناہٹیں۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اُس کی خفگی محسوس نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ تو بہت ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ اپنے آپ سے اُلجھتی رہتی کہ کیوں اُسے خفا کیا۔ اُس کی بات مان کیوں نہ لی۔ لیکن یہاں وہ اپنی نفی کرتی جاتی کہ اُس کی ہر بات مان سکتی ہے ایک یہی نہیں۔ آخر وہ کیوں اپنی شخصیت مسخ کر دے۔ وہ جیسی ہے، ٹھیک ہے اور وہ کیوں اُس کے اندر کسی اور کو کھوج رہا ہے۔ اگر ایسا ہی شوق ہے، اس گھر کی خاموش فضاؤں میں جلترنگ بجوانے کا تو نادیہ اور سعدیہ کو لے آئے۔ آخر میں وہ تلخ ہو کر سوچتی تھی۔

ممانی جان اور پھر نانی اماں بھی سرمد کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کرنے لگیں۔ ایک وہی تو تھا جو اونچی آواز میں بولتا اور بات بے بات ہنسنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ اب وہی خاموش ہو گیا تھا تو ممانی جان اور نانی اماں کی تشویش فطری بات تھی۔ پہلے اُسے کریدتی رہیں کہ آخر اُسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ کیوں اتنا خاموش رہنے لگا ہے؟ وہ گول مول سا جواب دیتا۔ کام زیادہ ہے تھک جاتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ پتہ نہیں دونوں خواتین اُس کے جواب سے مطمئن ہوتی تھیں یا نہیں۔ اب نانی اماں بیٹھے بیٹھے اس قسم کی باتیں کرنے لگتیں۔

''پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے بچے کو، جانے کس کی نظر لگ گئی ہے؟''

''کسی کی نظر نہیں لگی۔ اُسے سعدیہ نادیہ یاد آتی ہیں۔''

وہ جل کر سوچتی اور اُن دنوں وہ نانی اماں کی ایسی باتوں سے اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہوئے راہِ فرار ڈھونڈ رہی تھی کہ ایک لمبے عرصے بعد ابو جی آ گئے۔ پتہ نہیں اُنہیں اس کی یاد کیسے آ گئی تھی۔ اور وہ کیونکر اُس کی کمی محسوس کرنے لگے تھے کہ آتے ہی کہنے لگے۔

''میں تمہیں لینے آیا ہوں بیٹا! تم میرے ساتھ چلو گی۔''

''مجھے؟ میں!!!'' وہ کتنی دیر تک اپنی طرف اشارا کیے کھڑی رہی۔

''ہاں بیٹا!'' ابو جی کے مشفق لہجے پر وہ گھبرا کر نانی اماں کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیوں میاں رب نواز! یہ اتنے عرصے بعد تمہیں بیٹی کی یاد کیسے آئی؟'' نانی اماں کچھ طنز سے پوچھنے لگیں۔

''یاد تو ہمیشہ رہی۔ بس میں حالات سے مجبور تھا۔'' پھر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''چلو گی ناں بیٹا!''

''نانی اماں اجازت دیں گی تب!'' وہ اپنا دامن بچا گئی۔

''تمہاری نانی اماں منع نہیں کریں گی۔'' ابو جی یقین سے بولے۔

''تم کل تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔''

ابو جی چلے گئے تو وہ نانی اماں کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ابو جی کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی تو ہمیشہ سے یہ خواہش رہی کہ وہ پرانے گھر میں ابو جی کے ساتھ رہے لیکن ساتھ ہی وہ نانی اماں، ماموں جان اور ممانی جان سے دور بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ یہ گھر جس نے اُسے تحفظ دیا تھا اور جہاں نہ کبھی اجنبیت کا احساس ہوا اور نہ کبھی کسی نے یہ جتایا کہ وہ اُس گھر کی لڑکی نہیں ہے۔ اور پھر وہ ستمگر بھی تو یہیں تھا جسے وہ انجانے میں اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی تھی۔ اور جو پچھلے کئی دنوں سے خفا ہو کر اُس کی جان پر بنائے ہوئے تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی۔

''بیٹا! اگر تم نہیں جانا چاہتیں تو اپنے ابو جی کو صاف منع کر دینا۔''

نانی اماں، ماموں جان اور پھر ممانی جان نے بھی یہی بات کہی اور یہی ایک بات صرف اُس کے منہ سے سُننے کے لیے وہ رات میں بہت خاموشی سے اُس کے کمرے میں چلی آئی۔ اُسے دیکھ کر وہ رُخ موڑنا چاہتا تھا کہ وہ ہمت کر کے اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''تمہیں پتہ ہے آج میرے ابو جی آئے تھے۔'' بغیر کسی تمہید کے بولی۔

''ہاں!'' وہ لاپروائی سے جواب دے کر وہیں کرسی پر ڈھے گیا۔

''پھر تو تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ مجھے لینے آئے ہیں۔'' وہ ایک دم سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اُس کے علم میں یہ بات نہیں تھی، جب ہی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ غیر یقینی بھی سمٹ آئی تھی۔

''کہیا میں اُن کے ساتھ چلی جاؤں؟'' اُس نے اُسے امتحان میں ڈال دیا کہ فوری طور پر وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔

''بتاؤ ناں سرمد، میں چلی جاؤں؟''

''تمہاری مرضی!'' پھر اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہاری خواہش پر منحصر ہے۔ یہاں رہنا

چاہو یا اُن کے ساتھ جاؤ۔''

''تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟'' وہ ہاتھوں سے پھسلتی آس کی ڈور کا آخری سرا مضبوطی سے تھامتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''مجھے کیا فرق پڑے گا؟'' وہ پتہ نہیں کیوں ہنسا تھا۔

''ہاں! تمہیں کیا فرق پڑے گا بھلا۔'' ایک عمر کا ضبط جواب دے گیا اور وہ پھٹ پڑی۔

''تمہارے نزدیک میری اہمیت ہی کیا ہے۔ میں تو چلتی پھرتی زندہ لاش ہوں۔ نہ ہنسنا نہ بولنا، نہ کوئی تفریح اور تم سمجھتے ہو، میرے اندر کوئی خواہش ہی جنم نہیں لیتی۔ نہیں سرمد علی! میرے سارے احساسات زندہ ہیں، تمام تر خواہشات سمیت۔ مزید جاننا چاہتے ہو تو سنو! میں برس ہا برس سے اپنے اندر تمہاری ہمراہی کی خواہش لیے پھرتی ہوں۔ تمہاری کج ادائیوں کے باوجود، کبھی اس خواہش کا گلا نہیں گھونٹا۔ اور تم کہتے ہو میرے جانے نہ جانے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' قدرے توقف کے بعد تلخی سے بولی۔

''ٹھیک کہتے ہو تم۔ تمہیں بھلا میرے خاموش وجود سے کیا سروکار ہو سکتا ہے، تمہیں تو ہنستے کھلکھلاتے، بے باک لوگ متاثر کرتے ہیں جو سارے لحاظ بھلا کر ساری حدیں پھلانگ جائیں۔''

وہ بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے ایک ٹک اُسے دیکھے گیا۔

''میں بھی ہنسنے کی خواہش رکھتی تھی۔ لیکن کبھی تم نے مجھے ہنسنے دیا؟ ہمیشہ میری کم روی کا مذاق اُڑا کر مجھے آزردہ کرتے رہے۔ میری رنگت، میری آنکھیں، میری خاموشی کس کس کو نشانہ نہیں بنایا تم نے۔ اور اب الزام بھی مجھے دیتے ہو!''

اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔ جب ہی خاموش ہو کر اُس کی طرف سے رُخ موڑ لیا۔ اور پھر اُسی طرح اس کے کمرے سے نکل بھی گئی۔ جبکہ وہ طویل سانس لے کر بیڈ پر گرا تو ایک خوبصورت

مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

اگلے دن وہ بہت خاموشی سے اُسے جانے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ نانی اماں اُس کے جانے سے بہت اُداس تھیں اور بار بار اُن کی آنکھیں چھلکنے لگتیں تو وہ اپنا کام چھوڑ کر اُن کے پاس بیٹھ جاتی۔

''نانی اماں! آپ اس طرح روئیں گی تو میں کیسے جا سکوں گی۔'' وہ اُن کے آنسو پونچھتے ہوئے خود بھی آزردہ ہو جاتی۔

''یہ تمہارے باپ کو بیٹھے بٹھائے پتہ نہیں کیا سوجھی۔ اچھی بھلی تو تم ہو یہاں۔''

''ایک نہ ایک دن تو مجھے جانا ہی تھا۔'' وہ اُسے آتے دیکھ کر بولی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ اپنے ابو جی کے ساتھ نہ جاتیں تو کوئی اور لینے آ جاتا۔ کیوں بڑی اماں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟''

وہ تائیدی نظروں سے نانی اماں کی طرف دیکھنے لگا تو وہ پُرسوچ انداز میں سر ہلانے لگیں۔

شام میں ابو جی آئے تو وہ ابھی ماموں جان کے ساتھ بیٹھے تھے کہ وہ اندر آ کر اپنا پیک شدہ سامان چیک کرنے لگی۔ سامان کیا تھا، بس ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ اور اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب کچھ یہیں چھوڑے جا رہی ہو۔

''کیا رہ گیا ہے؟'' وہ جھنجھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اور اسی وقت وہ بہت خاموشی سے اندر چلا آیا۔

''تو تم جا رہی ہو؟'' پتہ نہیں کیا تھا اُس کے لہجے میں کہ وہ بہت خاموشی سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گا لیکن تمہیں واپس یہیں آنا ہے۔''

''میں اب یہاں نہیں آؤں گی۔'' وہ خواہ مخواہ بیگ کھول کر اُس کے اندر جھانکنے لگی۔

''میں لینے آؤں گا تب بھی نہیں؟'' وہ چکر کاٹ کر اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''تم کیوں لینے آؤ گے؟''

''ظاہر ہے، تمہارے جانے سے یہاں.....''

''کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔

''فرق پڑے گا سجو!'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور بیگ پر ٹکے اُس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''میرا خیال تھا تم مجھے سمجھتی ہو گی، لیکن تم نے تو ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ میری چھیڑ چھاڑ، میری شوخیوں کو طنز پر محمول کرتی رہیں۔ میں نے کبھی تمہارا مذاق نہیں اُڑایا۔ سجو! تم ہی بتاؤ، کبھی کوئی اپنی متاعِ عزیز کا بھی مذاق اُڑاتا ہے؟''

''تم.....'' وہ اسی قدر کہہ سکی۔

''ہاں سجو! ہمراہی کی خواہش صرف تمہارے اندر ہی نہیں مچلی، میں خود اس خواہش کا اسیر رہا ہوں۔ اور پتہ ہے! تمہیں تنگ کرنے، چھیڑنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ کسی طرح تم اپنے دل کی بات کہو اور اگر کہو نہ تو تمہارے کسی انداز سے تو ظاہر ہو لیکن تم بہت گہری ہو سجو! برس ہا برس خاموش رہیں۔''

''خاموش تو تم بھی رہے۔'' وہ بے اختیار اور شاید بے خیالی میں کہہ گئی اور وہ ہنس پڑا۔

''صرف زبان سے نہیں کہا، ورنہ میرا ہر انداز خاص کر آنکھیں محبت کا پیغام دیتی رہیں۔ لیکن تم شاید آنکھوں کی زبان نہیں سمجھتیں۔''

وہ کچھ دیر تک دیکھتی رہی، پھر اُس کی طرف سے رُخ موڑتے ہوئے بولی۔

''تمہیں تو غالباً سعدیہ اور نادیہ جیسی لڑکیاں پسند ہیں۔ اور میں اُن جیسی نہیں ہو سکتی۔''

''تمہیں کس نے کہا کہ تم اُن جیسی ہو جاؤ۔''

''تم ہی نے تو کہا تھا۔''

''اچھا!'' وہ اپنی کہی ہوئی بات سوچتے ہوئے بولا۔ ''وہ میں نے یونہی غصے میں کہہ دیا تھا۔ اصل میں جو بات میں تمہارے منہ سے برسوں سے سننے کا متمنی تھا وہ نادیہ نے دو دن میں کہہ دی تھی۔ اس لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اُن جیسی کیوں نہیں ہو۔''

''بہر حال، اب تو میں جا رہی ہوں۔'' جب سمجھ میں نہیں آیا کہ اُس کی بات کا کیا جواب دے تو جانے کی بات کرنے لگی۔

''ٹھیک ہے ضرور جاؤ، لیکن واپس تمہیں یہیں آنا ہے۔''

اُس نے جھکی نظروں کے ساتھ ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا اور بیگ اُٹھا کر کمرے سے نکل آئی۔ مزید اُس کے سامنے کھڑے رہنا خاصا مشکل تھا کہ دھڑکنوں نے تو انداز بدلا، چہرے پر بھی رنگوں کی برسات اُترنے لگی تھی۔ اور اس شوخ سے کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ پل میں سنجیدگی کا لبادہ اُتار کر چھیڑنے کھڑا ہو جاتا۔

صبح سے وہ نانی اماں سے بار بار یہی کہتی رہی تھی کہ اب دوبارہ یہاں کبھی نہیں آئے گی، لیکن جب ابو جی کے ساتھ جانے لگی تو نانی اماں سے گلے ملتے ہوئے اُن کے کان میں آہستہ سے بولی۔

''نانی اماں! میں جلد ہی واپس آؤں گی۔'' جواب میں نانی اماں نے ایسی آہ بھری کہ وہ بس انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

یہ شاید وہی گھر تھا جہاں اُس نے کچھ وقت امی کی آغوش میں گزارا تھا۔ گو کہ اُسے کچھ یاد تو نہیں تھا۔ پھر بھی اس گھر پر ایک دوسری عورت کی حکمرانی نے اُسے احساسِ محرومی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ اور اندر ہی اندر کچھ خوفزدہ بھی تھی کہ پتہ نہیں اس گھر میں اُس کا کیا مقام ہو۔ اور دوسرے وہ عورت، اُس کے ساتھ کیا سلوک کرے لیکن اس وقت وہ خوف سے نکل آئی جب اُس دوسری عورت نے کھلے دل سے اُسے خوش آمدید کہا اور خود سے بڑھ کر گلے لگایا۔ چھوٹے بہن بھائیوں

نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

رات میں جب وہ فراغت سے بیٹھی تو تینوں بہن بھائی اُس کے پاس آ بیٹھے۔ سب سے بڑا عمران، میٹرک میں تھا۔ اُس سے چھوٹا زمان آٹھویں میں اور ان دونوں سے چھوٹی فرح چھٹی کلاس میں تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ تینوں بچے خاصے ذہین اور سلجھے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں اچھے سکولوں کی تعلیم نے اُن کی شخصیت کو نکھار کر اعتماد بخشا تھا یا اُن کی ماں کی تربیت اچھی تھی۔ وہ دل ہی دل میں سراہے بغیر نہ رہ سکی۔

ساتھ ہی ایک بات جو اسے کھٹکی، وہ ان کا لہجہ تھا۔ یعنی اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنے آپ کو پرپوز کرنا۔ راستے میں ہی ابو جی نے اُسے اپنے بزنس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک دو پلاٹ خرید کر اُس پر مکان تعمیر کرتے ہیں، پھر منافع پر بیچ دیتے ہیں۔ یعنی کنسٹرکشن کے ابتدائی مراحل میں تھے، جبکہ بچوں کا انداز یہ بتاتا تھا جیسے اُن کا باپ کسی بہت بڑے پلازا کا مالک ہو۔ پھر اگلے چند دنوں میں اُس نے اس دوسری عورت جنہیں وہ آنٹی کہنے لگی تھی، اُن کی باتوں سے بھی محسوس کیا جیسے ابو جی کسی بہت بڑے پروجیکٹ پر کام کر رہے ہوں۔ یا ایسا کوئی پروجیکٹ اُنہیں ملنے والا ہو۔

بہر حال اُس کے لیے یہ تشویش کی نہیں بلکہ خوشی کی بات تھی اور پھر اُسے کیا فرق پڑتا تھا کہ آنٹی اس گھر سے نکل کر ہزار گز کے بنگلے میں رہنے کی باتیں کرتی تھیں۔ اُس نے کون سا زیادہ عرصہ یہاں رہنا تھا۔ وہ تو انتظار میں تھی کہ کسی دن نانی اماں اور ماموں جان وغیرہ آئیں گے اور اُسے ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اور ابھی وہ انتظار کی گھڑیاں گن رہی تھی کہ ابو جی نے نیا گھر خریدنے کی اطلاع دی۔ آنٹی اور بچے بے حد خوش تھے اور نئے گھر میں شفٹ ہونے کے لیے خاصے پُرجوش۔ آنٹی نے اسے اپنی پسند اور مرضی کے مطابق ڈیکوریٹ کیا۔

کافی دن بعد جب اس نئے گھر میں اطمینان سے بیٹھنا ہوا تو وہ آنٹی سے کہنے لگی۔

''آنٹی! میں خط لکھ کر ماموں جان کو اس نئے گھر کا ایڈریس بھیج دوں تاکہ وہ آئیں تو

اُنہیں دشواری نہ ہو۔'' جواب میں آنٹی نے خاصی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔

''بھیج دو لیکن میرا خیال ہے، اب وہاں سے شاید ہی کوئی آئے۔''

''نہیں آنٹی، وہ ضرور آئیں گے۔ ممانی جان اور سرمد نے خاص طور سے کہا تھا۔''

''اچھا!'' آنٹی استہزائیہ انداز میں ہنسیں، پھر اُس کی ٹھوڑی چھو کر کہنے لگیں۔

''یونہی تمہارا دل رکھنے کی خاطر کہا ہوگا۔ ورنہ جب سب رشتے ہی توڑ دیے جائیں تو پھر یہاں کیا کرنے آئیں گے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''کیا واقعی تمہیں نہیں معلوم!'' آنٹی اُسے متجسس کرنے کی خاطر ایسے لہجے میں بولیں۔ ''میرا تو خیال تھا تمہیں معلوم ہوگا، تمہارے ابو جی نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔''

''ک۔ کیا؟'' وہ الجھنے لگی۔

''یہی کہ تمہیں یہاں لاتے وقت تمہارے ابو جی نے تمہاری نانی اماں اور ماموں وغیرہ سے تمہارے سلسلے میں بات کی تھی کہ اگر اُن کا ارادہ تمہیں ہمیشہ وہیں رکھنے کا ہو، میرا مطلب ہے سرمد کے ساتھ شادی کا تو تمہیں وہیں چھوڑ دیا جائے یا پھر کچھ دنوں بعد وہ آ کر یہاں سے شادی کر کے لے جائیں لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' آنٹی لمحہ بھر کو خاموش ہوئی تھیں کہ اُس نے فوراً پوچھا۔

''اُنہوں نے منع کر دیا۔ صاف کہا کہ اُن کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور تمہاری ممانی نے تو یہاں تک کہا کہ وہ اپنی بہن کی لڑکی کو لانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔''

''کون؟ نادیہ!''

''پتہ نہیں۔ نام وغیرہ تو میں نہیں جانتی۔ بہر حال تمہارے ابو جی بہت دلبرداشتہ ہوئے تھے۔''

اور دل تو اُس کا بھی ٹوٹا تھا یوں کہ پھر آنٹی کی مزید کوئی بات سنی ہی نہ گئی۔ کوئی دیوار

گری تھی شاید کہ یہاں وہاں ہر طرف شور ہی شور تھا۔ چُپ چاپ آنٹی کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتی رہی، پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھیں وہ۔ اور پھر اُسی طرح خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سامنے آئینے میں اپنے آپ پر نظر پڑی تو لگا جیسے وہ کہیں آس پاس کھڑا شوخی سے گنگنا رہا ہو۔

ے نالے لُچی تے نالے کالی

''سرمد!'' ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔

''تم نے ہمیشہ میرا مذاق اُڑایا ہے اور آخری وقت میں بھی نہیں چھوڑا۔ ایسا بھیانک مذاق!'' وہ بیڈ پر گری تو تکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی۔

☆☆☆

کسی سے نہ کوئی گلہ نہ کوئی شکایت۔ بس اپنے آپ سے لڑتی رہی، کبھی سرمد کا اُن آخری لمحوں میں محبتوں سے چُور لہجہ یاد آتا تو لگتا وہی سچ ہے اور آنٹی اس سچ کو جھٹلاتی ہوئی سامنے آ جاتیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کا یقین کرے۔ کئی بار سوچا کہ خط لکھ کر سرمد سے معلوم کرے لیکن پھر خیال آتا کہ اُس نے تو بہت جلد آنے کو کہا تھا۔ اور اگر وہ سنجیدہ ہوتا تو دیر کیوں کرتا۔

''ہو سکتا ہے، کوئی اُس پرانے گھر میں آیا ہو؟''

اس خیال کے ساتھ ہی اُس نے سرمد کو تو نہیں نانی اماں کو خط لکھا۔ محض اپنے نئے گھر کا ایڈریس بتانے کے لیے۔ پھر اُس کے بعد وہ بہت دن تک انتظار کرتی رہی۔ اس دوران آنٹی مسلسل اُس کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ اُس کی بے چینی، بے قراری، ہر آہٹ پر چونک چونک جانا اور اندر ہی اندر اپنے آپ سے لڑنے اور اُلجھنے کی کیفیت..... کچھ بھی تو ان کی تیز نظروں سے چھپا نہیں تھا۔

ان دنوں یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے اندر حوصلہ پیدا کر رہی ہے۔ اور کسی بھی دن آنٹی سے

کہے گی۔ میں نانی اماں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ آخر اُن سے پوچھوں تو سہی کہ ایک عمر سینے سے لگائے رکھنے کے بعد اچانک دودھ کی مکھی کی طرح نکال کیوں پھینکا اور ممانی جان نے تو ہمیشہ ہی کسی نہ کسی موقع پر جتایا کہ وہ اُسے اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔ پھر اچانک اُن کا ارادہ کیسے بدل گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے اندر حوصلہ پیدا کر لیتی، آنٹی اُس کے سامنے اس قسم کی باتیں کرنے لگتیں۔

''جب سے تمہارے ابو جی تمہارے ننھیال سے ہو کر آئے ہیں، تمہاری طرف سے بڑے فکر مند ہیں، ورنہ اب تک تو اُنہیں یہی اطمینان تھا کہ تمہارے ماموں جی تمہیں اپنی بہو بنا لیں گے۔''

پھر اپنی رائے دیتیں۔

''مجھے حیرت ہے کہ تمہیں پالنے کے باوجود وہ تمہارے لیے اس انداز سے نہ سوچ سکے۔ کس بات کی کمی ہے تم میں۔ ماشاء اللہ اچھی خاصی شکل وصورت ہے، بس ذرا رنگ دبتا ہوا ہے، اور رنگ کا کیا ہے۔ ادھر خوشی اور خوشحالی ملے، نکھر جاتا ہے۔ ابھی بھی اپنے آپ کو دیکھ لو، جب سے یہاں آئی ہو، پہلے سے کتنی نکھری نکھری سی ہو۔''

(گویا جتا دیا کہ تم وہاں خوش نہ تھیں۔ اور نہ ہی خوشحالی نصیب تھی)

پھر ایک اور خیال۔

''میرا خیال ہے اُنہوں نے یہ سوچا ہو گا کہ تمہیں جہیز نہیں ملے گا اور نہ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا ہے۔''

پھر آہ بھر کر بولیں۔

''بے وقوف ہیں وہ لوگ جو ایسا سمجھ بیٹھے۔ یہ ضرور ہے کہ تمہارے ابو جی مصروفیت کی وجہ سے تمہارے پاس آ نہ سکے۔ لیکن وہ کبھی تم سے بے خبر نہیں رہے۔ وہ تو تمہارے لیے اُس وقت سے چیزیں اکٹھی کر رہے ہیں جب ہمارے حالات اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔

اب تو خیر اللہ کا شکر ہے۔ ہم وہ کچھ دیں گے تمہیں جس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔"

اور کوئی سوال اس کی زبان پر آنے سے پہلے ہی کہتیں۔

"تم فکر مت کرو بجو! دیکھنا ہم کس شان سے بیاہیں گے تمہیں۔ اور میں تو تمہارے ابو جی سے بھی یہی کہتی ہوں کہ فکر کس بات کی، اپنی بجو کے لیے رشتوں کی کمی تھوڑی ہے۔"

اور وہ جو اپنے اندر تھوڑا بہت حوصلہ پیدا کر پائی تھی وہ آنٹی کی باتوں نے توڑ دیا۔ نئے سرے سے سوچا تو آنٹی کی باتیں ہی سچ لگیں۔ اور برس ہا برس سے جو خواہش دل کے اندر پروان چڑھتی رہی تھی، وہ کسک بن گئی۔ وہ ساری ہستیاں جنہوں نے اُس وقت اُسے سینے سے لگایا تھا جب اپنے سگے باپ کی نظروں میں اُس کا وجود کھٹکنے لگا تھا۔ اور اُن کی محبتیں اور بے غرض چاہتیں، جن کی جڑیں اُس کے اندر تک پھیلی تھیں اُنہیں ایک دوسری عورت نے بہت خوبصورتی سے کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے مقصد میں اس حد تک کامیاب ہوئی کہ جب وہ یعنی جمیلہ رب نواز بیاہ کر جنید خان کے سنگ جا رہی تھی تو اُس کی سوچوں کا انداز یکسر بدل چکا تھا۔ جنید خان کے عالیشان بنگلے کے عالیشان بیڈ روم میں بیٹھی مانوس دھڑکنوں اور غیر مانوس آہٹوں کے ملے جُلے شور میں گھری سوچ رہی تھی۔

"کس قدر دو غلے ہیں ممانی جان اور سرمد، اور لالچی بھی۔ مجھے شاید لاوارث سمجھ لیا تھا۔ اب آ کر دیکھیں تو ذرا! ابو جی نے کس شان سے مجھے رخصت کیا ہے۔ اور ایسا عالیشان گھر تو اُنہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔"

اُس نے اپنی کلائیوں میں پڑی درجن بھر سونے کی چوڑیوں کو دیکھا۔ پھر ذرا سا سر اونچا کر کے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ ہر شے نہایت قیمتی اور خوبصورت تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خود اُس نے بھی کبھی ایسا تصور نہیں کیا تھا۔ لمحہ بھر کو یوں لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو، لیکن پھر خود ہی ہنس پڑی۔

"اتنا اعلیٰ ذوق رکھنے والا پتہ نہیں خود کیسا ہوگا!" اُس نے سوچتے ہوئے گھٹنوں پر

ٹھوڑی ٹکائی ہی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر فوراً سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"سوری ہنی! میں ذرا لیٹ ہو گیا۔" آنے والا تیز قدموں سے اندر داخل ہوا تھا۔ اور آتے ہی یوں بولا جیسے اُسے کسی میٹنگ میں پہنچنے میں دیر ہو گئی ہو۔

"کم آن ڈیئر! تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو۔ جاؤ چینج کر کے آؤ۔"

اُس کے لہجے میں بے زاری محسوس کر کے اُس نے سر اُٹھایا تو جیسے ساکت ہو گئی۔ سامنے کھڑا پچپن ساٹھ سالہ جنید خان کوٹ اتارنے کے بعد ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر رہا تھا۔ یہ صحیح ہے اُس کی صحت قابلِ رشک تھی اور پیسے کی فراوانی نے چہرے پر گزرتے ماہ و سال کی لکیریں بھی نہیں کھینچی تھیں۔ لیکن جذبات کی وہ لہریں نہیں تھیں جو اَن چھوتی کلی کو دیکھ کر سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ایسا دریا جو سارے طوفانوں سے گزر کر اب اس مقام پر ٹھہر گیا تھا، پرسکون ہو گیا تھا۔ یا پھر بوڑھا اور کمزور کہ طوفانوں سے لڑنے کا حوصلہ تو تھا لیکن وہ جوش نہیں جو ایامِ جوانی میں اکساتا ہے۔

"لیزی گرل! اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟" اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونکی۔ سر جھٹک کر بیڈ سے اُتری اور سیدھی ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ ذہن اچانک یوں ماؤف ہو گیا تھا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہ سکی۔

ڈنر ڈائننگ روم میں موجود چند افراد کا تعارف جنید خان نے یوں کروایا۔

"یہ ہمارا سب سے بڑا بیٹا ہے طاہر خان۔ آجکل یہ اسلام آباد میں ہوتا ہے اپنے بیوی بچوں سمیت۔"

اُس نے ذرا سی پلکیں اُٹھا کر سامنے بیٹھے طاہر خان کو دیکھا اور اُس کی نظروں میں اپنے لیے ناگواری محسوس کر کے فوراً دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔

"طاہر کے بعد یہ فریحہ ہے، ہماری اکلوتی بیٹی۔ یہ یہیں کراچی میں ہوتی ہے۔ اُس کا میاں بہت کامیاب بزنس مین ہے۔"

اُس نے دیکھا وہ تفخر کے احساس میں گھری اس سے لاتعلق نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

''اور یہ آصف خان ہے۔گزشتہ ماہ ایم بی اے کر کے لوٹا ہے۔اور اب میرے بزنس کو مزید پھیلائے گا۔میں کوشاں۔''

ان دونوں کی نسبت وہ قدرے بہتر نظر آیا کہ اُسے دیکھ کر مسکرایا بھی اور ہیلو بھی کہا۔

''سب سے چھوٹا بنٹی، اپنے کمرے میں ہے، تم ناشتے کے بعد اُس سے مل لینا۔'' بات کے اختتام پر اُنہوں نے دونوں ہاتھوں کو ایک خاص انداز سے اُٹھا کر تعارف مکمل ہونے کا اشارا دیا۔پھر اُن سب کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

''اور بچو! یہ تمہاری ممی ہیں۔''

''ممی!'' فریحہ ہنسی۔''فار گاڈ سیک ڈیڈی! اتنی لڑکی کو آپ ہماری ممی تو نہ کہیں۔اور میں پوچھتی ہوں یہ بیٹھے بٹھائے آپ کو شادی کی کیا سوجھی۔یہ کوئی عمر ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا، میں بوڑھا ہو گیا ہوں کیا؟''

''بوڑھے تو نہیں ہوئے۔'' طاہر خان فریحہ کا ساتھ دیتے ہوئے بولا۔''لیکن جوان بچوں کے باپ ہونے کے ساتھ ساتھ نانا اور دادا بھی ہیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''آپ کو فرق نہیں پڑتا لیکن ہمارے لیے خاصی مشکل کھڑی کر دی ہے آپ نے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''آپ کو سوچنا چاہیے تھا کہ آپ کے اس اقدام سے ہماری گھریلو زندگی کتنی ڈسٹرب ہو گی۔''

''اور کیا!'' فریحہ بول پڑی۔''میرے سسرال میں جب سب کو معلوم ہو گا تو میری پوزیشن کتنی خراب ہو گی۔'' اپنی پوزیشن کا کتنا خیال تھا اُنہیں۔اور جو اُس وقت اُس کی پوزیشن

آکورڈ ہو رہی تھی، اس کا خیال کسی کو نہیں آیا کہ وہ ایک رات کی دلہن، ان باتوں سے اپنے آپ میں چور سی بن رہی تھی جیسے سارا قصور اُسی کا ہو۔

''سارہ کو نہیں جانتے آپ!'' طاہر خان کہنے لگا۔''اُسے تو ایک موضوع مل جائے گا بچوں کا خیال کیے بغیر میرا ریکارڈ لگائے گی۔''

''بس!'' جنید خان میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔''بند کرواپنی اپنی بکواس۔مجھے اس گھر کے لیے عورت کی ضرورت تھی، سو میں لے آیا۔''

پھر قدرے نرم پڑتے ہوئے کہنے لگے۔

''مجھے بنٹی کا خیال تھا۔کس قدر تنہائی محسوس کرتا ہے وہ۔''

''آپ بنٹی کے لیے کسی گورنس کا انتظام بھی کر سکتے تھے۔'' فریحہ روٹھے لہجے میں بولی۔

''یہ سب کر کے دیکھ چکا ہوں۔گورنس اس وقت ٹھیک نہیں ہے، جب میں یہاں ہوتا ہوں اور جن دنوں میں باہر رہتا ہوں، اُسے اپنی من مانی کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔اور تم جانتے ہو، سال میں چار پانچ مہینے تو میرے باہر ہی گزرتے ہیں۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں۔بنٹی اسے قبول کر لے گا۔'' فریحہ کا اُس کی طرف اشارہ اور لہجہ انتہائی ہتک آمیز تھا۔اور مزید برداشت کی شاید اس میں طاقت نہیں تھی کہ بہت خاموشی سے کرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔اور جنید خان کو اگر اپنی اولادوں کا خیال نہ ہوتا تو یقیناً اُسے روکتے۔ٹھیک سے ناشتہ کرنے کے لیے کہتے لیکن اس وقت وہ بس اسے جاتا ہوا دیکھ سکے۔

اپنے کمرے میں آ کر بیٹھی تو اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔اور پھر رات میں جنید خان نے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔کم از کم اُسے تو بتا دیتے کہ اُن کی جوان اولادیں اس شادی پر رضامند نہیں تھیں۔وہ تو بس ابتدائی چند لمحوں میں اُنہیں دیکھ کر مایوس تھی۔اور شاید اُنہوں نے اُس کی کیفیت محسوس کی تھی جبھی جب وہ

باس تبدیل کر کے دوبارہ کمرے میں آئی تو وہ سرد مہری کا لبادہ اُتار چکے تھے۔ اور اُن کا یہ دوسرا روپ خاصا متاثر کُن تھا کہ وہ فوراً ہی مایوسیوں سے نکل کر نئی زندگی سے سمجھوتا کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ اور اب جو صورتِ حال سامنے آئی تھی، اس سے وہ بہت دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ گھر والوں، خاص کر آنٹی پر حیرت ہو رہی تھی کہ اُنہوں نے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ جنید خان اُس کے باپ کی عمر سے بھی بڑے ہیں۔ وہ تو بس اُن کے اعلیٰ اسٹیٹس، عالیشان گھر اور دوسرے ممالک تک پھیلے ہوئے بزنس کی باتیں کرتی رہی تھیں۔

جنید خان بہت عجلت میں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ شاید فوراً کہیں جانے کا ارادہ تھا لیکن اُسے یوں چُپ چاپ بیٹھے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے اُس کے پاس رُک گئے۔

''کم آن سجیلہ! تمہیں ان باتوں کو محسوس نہیں کرنا چاہیے اور پھر انہیں کون سا یہاں رہنا ہے۔ ابھی فرحیہ اپنے گھر چلی جائے گی اور طاہر غالباً شام کی فلائیٹ سے جائے گا۔''

''آپ مجھے اُس سے ملوا دیجیے، جس کے لئے مجھے یہاں لائے ہیں۔'' اُن کی بات نظر انداز کر کے وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''بنٹی!'' وہ زیرِ لب بڑبڑائے، پھر قدرے جھنجھلا کر کہنے لگے۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو، میں تمہیں اپنے لیے لایا ہوں۔ مجھے بیوی کی ضرورت تھی اس لیے شادی کی ہے تم سے۔''

''اور بنٹی؟''

''بچوں کے سامنے کیا کہتا۔ مصلحتاً بنٹی کا سہارا لیا۔'' پھر جاتے جاتے کہنے لگے۔

''اور سنو، میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ گھر میں جو تھوڑا بہت وقت گزاروں، آرام اور سکون سے رہوں۔ تم سمجھدار لڑکی ہو۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ گھر میں کوئی جھگڑا، کشیدگی یا ٹینشن برداشت نہیں کروں گا۔''

اُس نے بہت خاموشی سے اُنہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر کتنی دیر تک یونہی بیٹھی

رہی تھی۔

سٹنگ روم سے کچھ شور کی آواز آئی تو وہ چونکی۔ اور اُٹھ کر کمرے سے نکل آئی جہاں سے شور کی آواز آ رہی تھی اس طرف آ کر دیکھا تو ایک لڑکا وہیل چیئر پر بیٹھا ملازم پر برس رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اُس نے ملازم سے پوچھا۔

''بنٹی صاحب ناشتہ نہیں کر رہے۔''

''کہاں ہے بنٹی؟'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''یہ آپ کے سامنے موجود ہیں۔'' ملازم نے وہیل چیئر پر بیٹھے لڑکے کی طرف اشارہ کیا تو وہ حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ جس انداز سے گھر والے اس کا ذکر کر رہے تھے، اُس سے وہ یہی سمجھی تھی کہ بنٹی کوئی چھوٹا سا بچہ ہوگا۔ جبکہ اُس کے سامنے بیٹھا لڑکا اٹھارہ انیس سال سے کم کا نہیں تھا۔ اور اُسے یوں کھلی آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ پوچھنے لگا۔

''آپ کون ہیں؟''

''میں!'' وہ سنبھل کر کھڑی ہوگئی۔ اور اپنا تعارف کروانے کی بجائے کہنے لگی۔ ''مجھے چھوڑو میں کوئی بھی ہوں۔ یہ بتاؤ، تم ناشتہ کیوں نہیں کر رہے؟''

''میری مرضی!'' وہ اُکھڑے لہجے میں بولا۔

''اچھی بات ہے۔'' پھر ملازم کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ''تم جاؤ بابا۔ جب بنٹی کا دل چاہے گا ناشتہ کرے گا۔''

''ارے!'' بنٹی ہنسا۔ ''آپ نے تو بڑی جلدی میری بات سمجھ لی۔''

''اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات تھی؟''

''یہی تو میں بھی کہتا ہوں کہ آخر میری سیدھی سادی باتیں لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتیں۔ اب دیکھیے میرا ناشتہ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ لیکن بابا بضد ہیں کہ میں ناشتہ کر لوں کیونکہ ڈیڈی کا حکم ہے، اور ابھی کچھ دیر میں ڈیڈی فون کر کے بابا سے پوچھیں گے کہ میں نے ناشتہ کیا یا

نہیں۔'' کچھ دیر رُک کر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

''ہائے داوے آپ ہیں کون؟''

''تم بتاؤ۔'' وہ اُس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

''کہیں آپ میری گورنس بن کر تو نہیں آئیں؟''

''پتہ نہیں!''

''کیا مطلب! آپ کو اپنے بارے میں نہیں پتہ؟'' وہ ابھی کوئی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ آصف خان آ گیا۔ ان دونوں کو ایک جگہ دیکھ کر غالباً پہلے ٹھٹھکا تھا۔ پھر آتے ہوا بولا۔

''بنٹی! تمہارا تعارف ہو گیا ان سے؟''

''آپ جانتے ہیں انہیں؟'' بنٹی الٹا اس سے پوچھنے لگا۔

''ہاں بھئی، یہ ڈیڈی کی مسز ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری ممی!''

''ارے!'' بنٹی زور سے ہنسا۔ ''تو کیا ڈیڈی نے شادی کر لی۔ مجھے بتایا تک نہیں۔''

''کل رات ہی تو ہوا ہے یہ حادثہ۔'' پھر اُس کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا کر بولا۔ ''خوشگوار حادثہ۔''

''اچھی بات ہے۔'' بنٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ بہت محظوظ ہو رہا ہو۔ اُسے یک گونہ اطمینان ہوا، کیونکہ فریحہ نے کہا تھا، پتہ نہیں بنٹی اُسے قبول بھی کرتا ہے یا نہیں۔

''میرا بھی خیال ہے ڈیڈی نے اچھا کیا۔ لیکن طاہر بھائی اور فریحہ۔'' آصف برا سا منہ بنا کر خاموش ہو گیا۔

''کیوں! اُن دونوں کو کیا تکلیف ہے؟'' بڑے بھائی اور بہن کے لیے بنٹی کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔

''اُن دونوں کا کہنا ہے کہ سسرال والے اُن کا مذاق اڑائیں گے اور پتہ ہے، صبح ناشتے کی ٹیبل پر دونوں نے اُن کے سامنے انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ سچ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔''

پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''پلیز! آپ خیال مت کیجئے گا۔''

''وہ کیا کہتی، خاموش ہی رہی۔ اسی وقت بابا پھر ناشتے کے لیے پوچھنے آ گئے۔ تو آصف تعجب سے بولا۔

''کیا مطلب! تم نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا؟''

''دل نہیں چاہ رہا تھا۔''

''چلو اب کر لو، بلکہ انہیں بھی اپنے ساتھ شریک کر لو کیونکہ صبح یہ بغیر ناشتہ کیے اُٹھ کر چلی گئی تھیں۔''

''پہلے ایک بات طے کر لیں۔'' بنٹی نے کہا تو آصف کے ساتھ وہ بھی سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کہ ہم انہیں کیا کہہ کر مخاطب کریں؟''

''یہ واقعی سوچنے کی بات ہے۔'' آصف ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''او کے! میں آفس جا رہا ہوں۔ تم ان کے ساتھ طے کر لینا تو پھر مجھے بھی بتا دینا۔''

''آپ بتائیں، اپنے آپ کو کیا کہلوانا پسند کریں گی؟'' آصف کے جانے کے بعد وہ اُس سے پوچھنے لگا۔

''جو بھی نام دو۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ میری عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔'' اُس نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر ناشتے کے بعد اُس نے خود بنٹی کو اس کے کمرے میں پہنچایا اور آ کر گھر کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ فون آنٹی نے ہی اٹھایا۔ اُن کی آواز سنتے ہی وہ کہنے لگی۔

''آنٹی! آپ لوگوں میں سے کوئی آیا نہیں۔''

''ہاں وہ جنید خان نے منع کر دیا تھا۔''

''کیا مطلب؟؟ اُنہوں نے اپنے گھر آنے کو منع کیا ہے؟''

''نہیں نہیں۔'' آنٹی جلدی سے بولیں۔ ''میرا مطلب ہے یہ رسمیں وغیرہ پوری کرنے کو منع کیا ہے۔ پھر میں نے سوچا، جب ایسے ہی جانا ہے تو کسی وقت اطمینان سے چلے جائیں گے، تم خوش ہو؟''

''جی!'' وہ یہی جواب دے سکتی تھی۔

''اور ہاں سنو! صبح تمہارے ماموں جان کا ٹیلی فون آیا تھا۔''

''اچھا! کیا کہہ رہے تھے؟''

''تمہارا پوچھ رہے تھے کہ شادی ٹھیک ٹھاک ہوگئی۔ اور مبارکباد بھی دے رہے تھے۔''

''اس کی بھی کیا ضرورت تھی۔'' اُس نے آہستہ سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ اگر خوش نہیں تھی تو ناخوش بھی نہیں تھی۔ وہ ایک شخص سرمد علی جس کی ہمراہی کی خواہش برس ہا برس تک دل میں مچلتی رہی تھی۔ وہ اگر مقدر میں نہیں تھا تو پھر کوئی بھی ہو، اس سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کیونکہ زندگی تو بہر حال گزارنی ہی تھی۔ اور وہ ہمیشہ ابو جی کے گھر نہیں بیٹھی رہ سکتی تھی۔ کسی وقت وہ اپنے حال کا موازنہ ماضی سے کرتی تو اسے حیرت ہوتی کہ اتنی جلدی کتنی بدل گئی ہے۔ پہلے وہ کیا تھی، کنوئیں کی مینڈک۔ گھر کے کاموں اور سلائی کڑھائی کے علاوہ کچھ نہ آتا تھا۔ اور وہ نہ جانتی تھی گھر کی چار دیواری سے باہر کی دنیا کیسی ہے اور وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی حالانکہ اس نے انٹر تک پڑھا تھا۔ اس دوران وہ گھر کی محدود زندگی سے ہٹ کر بھی کچھ دیکھ اور سوچ سکتی تھی لیکن سرمد نے اسکول اور کالج لانے لے جانے ذمہ داری اتنی پابندی سے نبھائی تھی، بلکہ ایک طرح سے اس پر مسلط ہی رہا تھا کہ وہ اس سے ہٹ کر نہ کچھ دیکھ سکی، نہ سوچ سکی تھی۔ پھر ابو جی کے گھر وہ بس تین مہینے ہی رہی اور ان تین مہینوں

میں پہلے کچھ وقت انتظار میں کٹا، باقی ملال میں۔ اور اب اتنا ہی عرصہ اسے یہاں آئے ہوئے بھی ہو گیا تھا۔ گو کہ اب بھی اس کا بیرونی دنیا سے اتنا واسطہ نہیں تھا۔

لیکن اس بڑے سے گھر کے اندر رہ کر بھی وہ بہت کچھ جاننے اور سمجھنے لگی تھی۔ نہ صرف گھر سے باہر بلکہ شہر سے اور پھر ملک سے باہر کی باتیں بھی۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، کس طرح بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگلنے کے لیے ہر وقت جبڑوں تک منہ کھولے رکھتی ہیں۔ اور یہی نہیں جب جس پر بس چلتا ہے، نگل بھی لیتی ہیں۔ پھر مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم اور بڑی طاقتوں کا خاموش تماشائی بنے رہنا۔ وہ بنٹی کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی پر کشمیر، بوسنیا، افغانستان اور بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کو دیکھتی تو اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ اور جب بنٹی ان خبروں پر تبصرہ کرنے کے ساتھ مزید حالات و واقعات پر روشنی ڈالتا تو وہ اندر تک لرز جایا کرتی تھی۔ پھر خاص طور سے اپنے ملکی حالات، سیاسی، اقتصادی، معاشی جیسے اسے ازبر ہو گئے تھے۔ اور وہ خود بھی ان پر تبصرہ کرنے لگی تھی۔ اسے اپنے آپ پر حیرت بھی ہوتی کہ آخر وہ اتنی بے خبر کیوں رہی۔

اُس روز ناشتے کی ٹیبل پر جنید خان نے سرسری انداز میں بتایا کہ وہ گیارہ بجے کی فلائیٹ سے کراچی جا رہے ہیں۔ اور سُنا تو اُس نے بھی بے خیالی میں تھا۔ لیکن پھر اچانک اس شہر میں گزرے ماہ و سال اُس کے دل و ذہن میں دستک دینے لگے تھے۔ اور وہ ساری ہستیاں جنہوں نے ایک عمر محبت سے سینے سے لگائے رکھنے کے بعد آخر میں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا، وہ سب یاد آنے لگیں۔ گو کہ اب وہ ان سب کو شدت سے یاد نہیں کرتی تھی۔ اور نہ ہی اُن کے لیے مثبت انداز سے سوچتی، پھر بھی اُس آنگن میں گزرے ماہ و سال ایسے نہیں تھے، جنہیں ہمیشہ کے لیے بھلا دیا جاتا۔ بچپن، لڑکپن، جوانی، یہ سارے موسم اُس پر اس آنگن میں تو اترے تھے۔ اور پھر نانی اماں جن کی آغوش میں اُسے ممتا کی نرمی گرمی ملی تھی اُن کی یاد اتنی شدت سے آئی۔ وہ فوراً اُن کے پاس جانے کو بے چین ہو گئی۔ ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تو اُن سے کہنے لگی۔

''خان صاحب! میں بھی آپ کے ساتھ کراچی چلوں گی۔''

اس تمام عرصے میں اس نے پہلی بار اُن کے ساتھ کہیں جانے کی بات کی تھی۔ اس لیے وہ قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''تم بہت بور ہو گی ڈیئر! کیونکہ میں تو وہاں بہت مصروف رہوں گا اور پھر میرا کام ایسا ہے کہ۔۔۔''

''میں آپ کے کام میں مخل نہیں ہوں گی خان صاحب!'' وہ جلدی سے بولی۔

''وہاں میری نانی اماں ہیں، ان کے پاس چلی جاؤں گی اور جب تک آپ وہاں رہیں گے میں نانی اماں کے پاس رہوں گی۔''

''اچھا!'' کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ٹھیک ہے تم تیاری رکھو، میں جاتے ہوئے تمہیں لیتا جاؤں گا۔''

''تھینک یو۔'' وہ خوش ہو گئی، اور اُن کے جاتے ہی اُن کے بریف کیس کے ساتھ اپنا بیگ بھی تیار کر لیا۔ پھر وقت گزاری کے لیے بنٹی کے پاس آ بیٹھی۔

''کیا بات ہے کسی کا انتظار ہے کیا؟'' باتوں کے دوران اُسے بار بار گھڑی دیکھتے دیکھ کر بنٹی پوچھنے لگا۔

''ہاں۔ وہ تمہارے ڈیڈی آئیں گے۔''

''اس وقت!''

''اصل میں، میں ان کے ساتھ کراچی جا رہی ہوں۔''

''اچھا! تو اس لیے اتنی خوش نظر آ رہی ہیں۔ بائے داوے آپ کو کراچی جانے کی خوشی ہے یا ڈیڈی کے ساتھ جانے کی۔'' اُس نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ اُسے گھورتے ہوئے بولی۔

''دونوں باتیں ہیں۔''

''پھر تو مجھے کہنے دیجیے کہ آپ کی خوشی عارضی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی نہ تو ڈیڈی کا ساتھ آپ کو خوشی دے سکتا ہے اور نہ وہ ہنگاموں بھرا شہر۔ آپ بہت بور ہوں گی۔ ویسے بھی ڈیڈی وہاں بہت مصروف رہیں گے۔''

''میں جانتی ہوں۔''

''پھر کیوں جا رہی ہیں؟''

''اصل میں میرے کچھ عزیز ہیں۔ میں اُن سے ملنے جا رہی ہوں۔''

''فرسٹ ٹائم جا رہی ہیں؟''

''نہیں بھئی۔ میں تو شروع سے وہیں رہی ہوں۔ یہاں تو میں کچھ عرصہ قبل ابو جی کے ساتھ آئی تھی۔''

پھر تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں بہت چھوٹی سی تھی، جب میری امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر ابو جی نے دوسری شادی کی تو میری نانی اماں مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ اُنہوں نے ہی میری پرورش کی۔ میری شادی پر وہ آ نہیں سکی تھیں۔ اور میں اب اُن سے ملنے جا رہی ہوں۔''

''یہ بات ہے تو پھر واپسی کب ہو گی؟''

''تمہارے ڈیڈی کے ساتھ ہی۔''

''اور اگر ڈیڈی کل ہی واپس آ گئے تب؟''

''تب پھر یہ اُن پر منحصر ہے کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے وہیں چھوڑ دیں یا ساتھ لیتے آئیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''میں آپ کو روک تو نہیں سکتا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ زیادہ دن وہاں مت رہیے گا، میں بہت اکیلا ہو جاؤں گا۔''

وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر ناخنوں سے کیوٹکس کھرچتے ہوئے بولی۔

''ایک بات پوچھوں بنٹی، بُرا تو نہیں مانو گے؟''

''نہیں، آپ پوچھیں۔''

''تمہارے ساتھ یہ حادثہ کب اور کیسے ہوا؟'' وہ اُس کی ٹانگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ پھر بہت خاموش نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ سوال تو آپ کو پہلے روز ہی پوچھنا چاہیے تھا۔ اتنی دیر بعد کیسے خیال آیا؟'' وہ افسردہ نظر آنے لگا تھا۔

''پہلے میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ کہیں تمہاری دل آزادی نہ ہو۔''

''اچھا!'' وہ دکھ سے ہنسا۔ ''میں تو سمجھا تھا، اب تک آپ نے غور ہی نہیں کیا۔ دیکھا ہی نہیں کہ میں وہیل چیئر پر بیٹھتا ہوں کیونکہ اور لوگ تو سب سے پہلا سوال ہی یہی کرتے ہیں۔''

اُس کے خاموش رہنے پر کہنے لگا۔

''پہلے حیرت کا اظہار پھر افسوس، تاسف اور آخر میں ہمدردی، مجھے بے تحاشا غصہ آتا ہے۔ دل چاہتا ہے، ان سے پوچھوں، ابھی راستے میں آتے ہوئے کتنے معذور لوگوں کو دیکھا۔ اور کیا ہر ایک کے پاس رُک کر انہوں نے اسی طرح افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ اگر نہیں تو پھر مجھ سے کیوں؟ میں اپنے آپ کو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھتا۔ آرام سے سارا دن بیٹھا رہتا ہوں۔ خدمت کے لیے ملازم موجود ہیں، جو ایک آواز میں دوڑے آتے ہیں۔ اور کیا چاہیے مجھے۔ ہمدردی کرنی ہے تو اُن سے کریں جو واقعی مستحق ہیں۔ لیکن نہیں! وہ سب ایسا کیوں کریں گے۔ راستہ چلتے لوگوں سے ہمدردی کے دو بول بول کر اُنہیں کیا ملے گا بھلا؟''

وہ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ اُسے افسوس ہونے لگا کہ اس وقت کیوں یہ سوال کر بیٹھی۔

''آئی ایم سوری، مجھے شاید اب بھی نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔''

''سوری، مجھے آپ کو یہ سب نہیں کہنا چاہیے۔''

وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''آپ بھی کیا سوچتی ہوں گی کہ میں.....''

''نہیں میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا۔''

وہ اُس کی بات کاٹ کر بولی۔

''مجھے تمہاری باتوں سے اتفاق ہے، میں جانتی ہوں لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ.....''

اُس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ جنید خان بڑی عجلت میں اندر آئے تھے، اور آتے ہی چلنے کے لئے کہا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''او کے بنٹی! تم اپنی روٹین خراب مت کرنا، میں جلدی واپس آؤں گی۔''

پھر مسکرا کر اس کا ہاتھ تھپکا اور جنید خان کے ساتھ باہر نکل آئی۔

دو گھنٹے بعد وہ کراچی کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں جنید خان کے ساتھ لنچ کر رہی تھی۔ جنید خان نے آتے ہی اپنی فرم کے منیجر کو فون کر دیا اور کسی بھی وقت ڈرائیور گاڑی لے کر آنے والا تھا۔

''تمہاری نانی اماں کا گھر کہاں ہے؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''سمن آباد۔''

''سمن آباد!'' وہ پُرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''یہ تو بہت مشکل ہو جائے گی۔''

''کیسی مشکل؟''

''اگر پہلے تمہیں سمن آباد چھوڑنے جاؤں تو دو گھنٹے لگ جائیں گے، جبکہ مجھے.....'' وہ گھڑی کی طرف دیکھنے لگے۔

''میں ماموں جان کو فون کر دیتی ہوں، وہ آ کر مجھے لے جائیں گے۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے، ورنہ میرا بہت وقت برباد ہوگا۔''

اُنہوں نے فوراً اس کی تجویز مان لی تو وہ کھانے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ماموں جان کے گھر فون کیا تو اتفاق سے وہ خود ہی مل گئے۔ اُس کی آواز سُن کر بہت خوش ہوئے۔ جب اُس نے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے فوراً آنے کی ہامی بھر لی۔ وہ مطمئن سی ہوگئی۔ فون رکھ کر جنید خان کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بریف کیس کھولے اپنی فائلوں میں اُلجھے تھے۔

وہ بہت خاموشی سے اُن کے سامنے جا بیٹھی۔ کچھ دیر بعد اُنہوں نے یونہی بے خیالی میں اُس کی طرف دیکھا۔ پھر ایک دم پوچھنے لگے۔

''کیا رہا؟''

''ماموں جان آرہے ہیں۔''

''تم نے اُنہیں کمرے کا نمبر بتا دیا ناں!''

''جی!''

''ٹھیک ہے۔ وہ آئیں تو تم اُن کے ساتھ چلی جانا۔ اور ہاں مجھے اُن کا نمبر بتا دو، جس روز واپسی ہوگی میں تمہیں فون کر دوں گا۔''

''آپ وہاں آئیں گے نہیں؟'' وہ اُنہیں نمبر لکھوا کر پوچھنے لگی۔

''اگر فرصت ملی تو آجاؤں گا، ورنہ تم میری طرف سے معذرت کر لینا۔''

پھر بریف کیس بند کر کے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں پتہ نہیں کیا بولے اور تکیہ کھینچ کر نیم دراز ہو گئے۔ وہ کچھ دیر تک یونہی اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ٹیبل سے میگزین اُٹھا کر اُس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ اُس کا اور اُن کا بھی خیال تھا کہ ڈرائیور ہوگا۔ اس لیے کم اِن کہہ کر اُٹھ بیٹھے اور سرمد کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اُس کے سلام کا جواب دے کر اُن سے کہنے لگی۔

''خان صاحب! یہ میرے کزن ہیں۔ ماموں جان کے بیٹے سرمد!''

''اوہ! اچھا۔'' انہوں نے سرمد کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ پھر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

''کمال ہے تم سمن آباد سے اتنی جلدی یہاں آگئے، جبکہ میرا ڈرائیور.....''

''میں سمن آباد سے نہیں آرہا۔''

''پھر؟''

''میرا آفس یہاں سے قریب ہی ہے۔ ابھی ابو جی نے فون کیا کہ مجھے اسی وقت بجیلہ کو لانا ہے اور میں آفس سے یہاں چلا آیا۔''

''چلو اچھا ہے۔ تم پہلے آگئے۔ ورنہ بجیلہ کو یہاں اکیلا چھوڑ کر جاتا تو میرا دھیان اِدھر ہی رہتا۔'' پھر اس سے کہنے لگے۔

''ٹھیک ہے ڈیئر! تم جاؤ!''

''آپ بھی چلیں۔'' سرمد نے انہیں بھی اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

''سوری بوائے! مجھے اپنے کام سے جانا ہے۔''

''اگر کوئی پرابلم ہے تو چلیں، ہم آپ کو چھوڑتے ہوئے چلے جائیں گے۔''

''نو پرابلم! میں نے آفس فون کر دیا ہے۔ ڈرائیور گاڑی لے کر آتا ہوگا۔''

وہ سہولت سے اس کی پیشکش رد کر گئے تو وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''چلیں پھر۔'' اس نے جنید خان کی طرف دیکھا اور ان کا اشارہ پا کر اپنا بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

''کیسے ہو؟'' اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تو پوچھنے لگی۔

''ویسا ہی جیسا کہ پہلے تھا۔'' پھر ایک نظر اس پر ڈال کر کہنے لگا۔ ''البتہ تم بہت بدلی بدلی لگ رہی ہو۔''

''اچھا!'' وہ خواہ مخواہ ہنسی۔ ''کس لحاظ سے؟''

''ہر لحاظ سے اور یقیناً یہ تبدیلی ایک بڑے آدمی کی لائی ہوئی ہے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' وہ لاپرواہی سے کہہ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

گھر میں نانی اماں، ماموں جان اور ممانی جان بہت بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ جب سرمد کے ساتھ آئی تو سب سے پہلے ممانی جان نے بڑھ کر اُسے گلے لگایا۔ اُن کے انداز میں وہی پہلے جیسی محبت اور گرم جوشی تھی۔ جبکہ وہ کسی طرح بھی اپنے اندر گرم جوشی پیدا نہ کر سکی۔ ماموں جان سے بھی اسی طرح ملی۔ البتہ نانی اماں کی آغوش میں کسی چھوٹی سی بچی کی طرح سما گئی۔ اور کتنی دیر تک اُن سے الگ ہی نہ ہوئی۔

''بس بھی کرو۔'' آخر سرمد کو ٹوکنا پڑا۔ ''چھ مہینے کوئی اتنے زیادہ تو نہیں ہوتے۔''

''کم بھی نہیں ہوتے۔'' وہ آنکھوں میں اُترا پانی رومال میں جذب کرتے ہوئے بولی۔

''چلو اب آرام سے بیٹھو۔'' سرمد نے کرسی کھینچ کر اس کے سامنے کر دی تو نانی اماں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولیں۔

''کیا اکیلی آئی ہو؟ تمہارے دولہا ساتھ نہیں آئے؟''

''دولہا!'' سرمد بے ساختہ اور زور سے ہنسا۔

''کیا ہوا؟'' ممانی جان اُس کے ہنسنے پر قدرے تعجب سے پوچھنے لگیں تو وہ اُسی طرح ہنستا ہوا اُسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''سُنا تم نے۔ نانی اماں کیا کہہ رہی ہیں۔ تمہارے دولہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا دولہا۔''

وہ مسہری پر ڈھے گیا۔ اور اس کے شاکی نظروں سے دیکھنے کے باوجود باز نہیں آیا۔ کہنے لگا۔

''میرے خدا!! اگر خان صاحب کو یہ پتہ چل جائے کہ یہاں انہیں دولہا کہا جا رہا ہے تو.....''

''تم پاگل ہو گئے ہو شاید۔'' وہ دبے دبے لہجے میں دانت پیس کر بولی تو وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ لیکن مسکراہٹ ہونٹوں پر مچلتی رہ گئی تھی۔

''باؤلا ہوا ہے کیا؟ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' نانی اماں نے بھی ڈانٹا۔

''ہنسنے کی بات تو ہے بڑی اماں کہ آپ ایک بڈھے کھوسٹ کو دولہا کہہ رہی ہیں۔''

''کیا!!'' ممانی جان آگے بڑھ آئیں۔ ''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''سجو کے دولہا میاں کی۔'' وہ اطمینان سے بولا تو ممانی جان اس کی طرف تاسف بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ وہاں نانی اماں نے بھی دانتوں میں انگلی دبالی تھی۔ اور اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔

''تم سے تو بہر حال ہزار درجے اچھے ہیں۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھ سے اچھے نہ ہوتے تو تم انہیں مجھ پر ترجیح کیوں دیتیں۔''

اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گیا۔ وہ اس کی بات نہیں سن سکی تھی۔ جب ہی سر جھکا کر دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔

''کیا ضرورت تھی مجھے یہاں آنے کی۔ جانتی بھی تھی کہ وہ اتنا بدتمیز ہے، پھر بھی چلی آئی۔''

ممانی جان اس کی خاموشی کو خفگی سمجھیں اور اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی غرض سے کہنے لگیں۔

''بیٹا! تم تو سرمد کی عادتوں سے واقف ہی ہو۔ اس کی باتوں کا برا مت ماننا۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

''بتاؤ تو سجو! کیا سچ مچ تمہارے دولہا.....'' رات میں وہ سونے کی غرض سے نانی اماں کے پاس لیٹی تو وہ بڑی رازداری سے اس سے پوچھنے لگیں۔

"نہیں تو نانی اماں۔" وہ ان کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔ "آپ بھی کس کی باتوں میں آ گئیں۔ اتنے اچھے ہیں جنید خان، بس ذرا سی عمر ہی زیادہ ہے۔"

"کیا پہلے شادی شدہ تھے؟" نانی اماں باقاعدہ کریدنے لگیں۔

"ہاں! لیکن بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"اور بچے؟"

"چار ہیں، تین لڑکے، ایک لڑکی۔"

"اوئی اللہ!" نانی اماں نے ماتھا پیٹ ڈالا۔ "کہاں قسمت پھوڑ دی تمہارے باوا نے تمہاری۔ چار بچوں کے باپ سے بیاہ دیا اور بچے تو تمہاری جان کو آ جاتے ہوں گے۔"

"نہیں نانی اماں! یہ سب نہیں ہے۔" وہ الجھ کر بولی۔ "بچے چھوٹے نہیں ہیں۔ سب بڑے بڑے ہیں۔ بڑا بیٹا اور بیٹی شادی شدہ ہیں۔ اور وہ ہمارے ساتھ رہتے بھی نہیں۔ تیسرے نمبر کا ابھی کچھ دنوں میں یہیں کراچی سیٹ ہو جائے گا۔ اور چوتھا بھی اٹھارہ انیس سال کا ہے۔"

اپنے طور پر اس نے نانی اماں کو مطمئن کرنا چاہا تھا جبکہ انہوں نے ماتھے کے بعد سینہ پیٹ ڈالا۔

"مت ماری گئی تھی تمہارے باوا کی جو اپنے سے بڑی عمر کے بندے کے ساتھ بیاہ دیا۔ میں کہتی ہوں اپنے سرمد میں کیا کمی تھی۔ گھر کا بچہ ساتھ پلا بڑھا لیکن تمہارے باوا مان کے نہ دیے۔"

"کیا کیا مان کے نہ دیے؟" وہ نانی اماں کی آخری بات پر چونکی اور اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"یہی تمہاری اور سرمد کی شادی کی بات۔"

"کس نے کی تھی؟"

"ہم سب نے۔ جس روز تمہارے باوا تمہیں لینے آئے تھے، اُسی روز میں نے

تمہارے ماموں اور ممانی نے۔"

"ممانی جان نے بھی۔" وہ غیر یقینی سے پوچھنے لگی۔

"اور کیا! تمہاری ممانی جان کی تو ہمیشہ سے خواہش تھی تمہیں بہو بنانے کی۔ اور اس روز جھولی پھیلا کر تمہیں مانگا لیکن تمہارے ابا کی ایک ہی ضد تھی۔ میں بات طے کر آیا ہوں۔ اپنی بات سے پھر نہیں سکتا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

"اب میں کیا کہوں تمہارے باپ کو۔ ساری عمر تو پوچھا نہیں، آخر میں حق جتا کر لے گیا۔ احسان فراموش ہے، کم از کم پالنے کا اتنا حق تو ادا کرتا کہ تمہاری شادی میں ہم سے مشورہ ہی لے لیتا۔"

نانی اماں اور بھی پتہ نہیں کیا کچھ کہتے کہتے سو گئیں تھیں۔ اور اُس کے لیے سوچوں کا ایک نیا باب کھل گیا تھا۔ پہلے تو اسے ان ساری باتوں کا یقین ہی نہیں آیا۔ پھر اس نے سوچا آخر نانی اماں اس سے غلط بیانی کیوں کریں گی، پھر وہ ہر بات کو نئے سرے سے سوچنے لگی۔

ابو جی کا برسوں بعد آنا اور اسے ساتھ لے جانا اور پھر آنٹی کا آہستہ آہستہ اسے اس گھر سے متنفر کرنا اور اپنے آپ کو اس کا سب سے بڑا ہمدرد ثابت کرنا، ہر بات اس پر واضح ہوتی چلی گئی۔

وہ کیوں اتنی نادان تھی کہ ایک دوسری عورت کی باتوں پر یقین کر کے ان ہستیوں پر شبہ کر بیٹھی جو کہ آج بھی اس سے اسی طرح محبت کرتی ہیں۔ ان کی محبتیں اتنی کمزور تو نہ تھیں، پھر وہ کیوں متنفر ہو گئی۔ وہ بہت دُکھ کے ساتھ اپنے آپ کو ملامت کر رہی تھیں۔

صبح وہ بہت جلدی اٹھ گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر کچن میں آئی تو سرمد پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ دروازے میں رُک کر خاموشی سے اسے چائے بناتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اور اس کی موجودگی کا احساس کر کے وہ کہنے لگا۔

"حسب [illegible] یہ ڈیوٹی میں نے سنبھال لی ہے۔" وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر کہہ

رہا تھا۔

''ویسے بھی اس وقت صرف میں ہی چائے پیتا ہوں اور صرف ایک کپ کے لئے امی کو اُٹھانا اچھا نہیں لگتا۔ اور پتہ ہے اب تو مجھے یہ سوچ کر بھی افسوس ہوتا ہے کہ اتنا عرصہ میں تم سے زبردستی اپنے کام کرواتا رہا۔ تمہیں بُرا تو لگتا ہوگا۔''

چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ اس نے کپ تھام لیا۔ لیکن اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ تب وہ اس کی غیر معمولی خاموشی محسوس کر کے چونکا۔

''کیا بات ہے کچھ پریشان ہو؟'' اُس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''شاید رات ٹھیک سے سو نہیں سکیں، یہی بات ہے ناں۔ جگہ تبدیل ہو جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' وہ خود ہی قیاس کرتا ہوا بولا۔ وہ پھر بھی خاموش رہی تو سٹپٹا گیا۔

''چلو اندر چل کر بیٹھو۔ میں امی کو اٹھاتا ہوں۔''

''نہیں رہنے دو اور تم یہاں سے نکلو، میں ناشتہ بناؤں گی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''کیا تم ناشتہ بناؤ گی؟''

''ہاں کیوں؟''

''نہیں بھئی، دو دن کے لیے آئی ہو اور پھر مہمان بھی ہو۔''

وہ کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بڑھ کر خالی کپ ریک پر رکھتے ہوئے بولی۔

''کل تم نے کہا تھا، تم ویسے ہی ہو جیسے پہلے تھے۔ لیکن تم ویسے نہیں ہو۔ ہاں کوشش ضرور کر رہے ہو کہ پہلے جیسے نظر آؤ۔''

''نہیں بھئی، میں.....''

''مت پوز کرو سرمد!''

''بند کرو یہ رسمی باتیں جیسی اجنبیوں کے درمیان ہوا کرتی ہیں۔ ہم اجنبی نہیں ہیں۔ ہم

کبھی بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہو سکتے۔ سمجھے تم!''

''ارے!'' وہ خجالت مٹانے کو ہنسا۔ ''تم تو اچھا خاصا بولنے لگی ہو۔''

''نہ صرف بولنے لگی ہوں بلکہ سمجھنے بھی لگی ہوں۔'' وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ ساری باتیں جنہیں وہ رات سمجھ سکی تھی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو رہی۔

''کیا سمجھنے لگی ہو؟''

''کچھ نہیں۔ اب پلیز تم ہٹو یہاں سے، مجھے ناشتہ بنانے دو۔''

وہ زبردستی اُسے باہر نکال کر چولہے کے پاس کھڑی ہو گئی، پھر جس وقت ممانی جان آئیں وہ ناشتہ تقریباً تیار کر چکی تھی۔

اُنہوں نے حیرت سے اُسے دیکھا، پھر یہی سمجھیں کہ سرمد نے پہلے کی طرح اُسے کام پر لگا دیا ہوگا۔ اور بغیر تصدیق کیے سرمد کو سخت سست کہنے لگیں۔

''انتہائی بدتمیز لڑکا ہے، ذرا خیال نہیں ہے۔ اس نے تمہیں اٹھا دیا ہوگا۔''

''نہیں تو ممانی جان، میں خود اُٹھی ہوں۔'' وہ اُن کے مزید کچھ کہنے سے پہلے بول پڑی۔

''بیٹا! اگر اُٹھ ہی گئی تھیں تو یہاں کچن میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''ممانی جان!'' وہ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔ ''میں مہمان نہیں ہوں۔''

''پھر بھی بیٹا!''

''بس آپ کچھ مت کہیں۔ اندر جا کر بیٹھیں، میں ناشتہ لے کر آ رہی ہوں۔'' کل وہ ممانی جان سے بہت سرد مہری سے ملی تھی اور اب جبکہ ساری باتیں اس پر واضح ہو گئی تھیں تو اُسے اس مہربان عورت پر بہت پیار آ رہا تھا۔ جس نے ایک عمر اُسے ماں کی آغوش بخشی تھی۔ دل چاہ رہا تھا، اس آغوش میں سمٹ کر اپنی ساری مجبوریاں کہہ سنائے۔ بتا دے اُنہیں کہ وہ ایک دوسری عورت کے فریب کا شکار ہو گئی ہے اور اُس وقت تو نہیں، ناشتے کے بعد جب ماموں جان اور سرمد

آفس چلے گئے اور کچھ وقت فراغت کا ملا تو نانی اماں نے پھر وہی باتیں چھیڑ دیں۔

''تمہارے باپ نے اچھا نہیں کیا۔ کیا تھا جو تمہیں ہمارے پاس چھوڑ دیتا۔ اگر پہلے سے کہیں زبان دے کر نہ آتا تو ہم کبھی بھی تمہیں اس کے ساتھ جانے نہ دیتے۔''

اور وہ رو پڑی، پہلے نانی اماں اور پھر ممانی جان کی گود میں سر رکھا تو ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

''ابو جی پہلے سے میری بات طے کر کے نہیں آئے تھے۔''

وہ روتے ہوئے بتانے لگی۔

''وہ ایک پلان کے تحت مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے، انہیں بڑے لوگوں کی قطار میں کھڑا ہونے کے لیے سہارا چاہیے تھا۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے میرے ارمانوں کا گلا گھونٹنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ اُنہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ جنید خان خود اُن سے عمر میں بڑا اور شادی شدہ بچوں کا باپ ہے۔ اُنہیں صرف اس بڑے پروجیکٹ سے دلچسپی تھی جو شادی کے بعد جنید خان کی معرفت انہیں ملا۔''

''مجھے تو تمہارے باپ کے لچھن شروع سے ہی کبھی اچھے نہیں لگے۔''

نانی اماں اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

''میں بھی کہوں، یہ اچانک کیسے محبت نے جوش مارا کہ آناً فاناً لے کے چلتا بنا۔ ہم کیا جانتے تھے کہ اس محبت کے پیچھے بھی اس کی غرض چھپی ہے۔''

''بیٹا جب تم جان گئی تھیں تو ہمیں خبر کرتیں، ہم تمہیں لے آتے۔'' ممانی جان نے کہا تو اس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں۔

''میں نہیں جانتی تھی ممانی جان۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی، یہ تو رات نانی اماں کی باتوں سے مجھ پر بہت ساری باتوں کا ادراک ہوا۔''

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''آنٹی نے مجھے بتایا تھا کہ جب ابو جی مجھے لینے آئے تھے تو اُنہوں نے آپ سب سے پوچھا تھا کہ اگر آپ کا خیال مجھے ہمیشہ کے لیے یہیں رکھنے کا ہو تو وہ مجھے یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن آپ نے منع کر دیا تھا۔''

''کیا؟'' ممانی جان تقریباً چیخ پڑیں اور نانی اماں آنٹی کو برا بھلا کہنے لگیں۔

''نامراد عورت! سوتیلی جو ٹھہری، کیسے تمہارا بھلا سوچ سکتی تھی۔ اور کیا اُس کی اپنی کوئی بیٹی نہیں ہے جو تمہیں یہاں سے بلا بھیجا۔''

''ہے، لیکن ابھی بہت چھوٹی ہے۔''

''تو اُس کے بڑے ہونے کا انتظار کر لیتی۔''

''چھوڑیں اماں!'' ممانی جان کہنے لگیں۔ ''آپ خواہ مخواہ اس عورت کو الزام دے رہی ہیں۔ اگر اس کا اپنا باپ ٹھیک ہوتا تو کیا مجال تھی اُس کی۔''

''ٹھیک کہتی ہو تم۔'' نانی اماں قائل ہو کر بولیں، پھر اُس کا سر تھپکتے ہوئے کہنے لگیں۔

''بیٹا اب میں تمہیں اس کے سوا کیا کہہ سکتی ہوں کہ صبر کرو، شاید نصیب میں ایسا ہی لکھا تھا۔''

''میں نے تو نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا نانی اماں! لیکن اب جب حقیقت معلوم ہوئی ہے تو دل درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ کیا دیا ہے ابو جی نے ساری زندگی مجھے۔ کبھی پوچھا تک نہیں اور جب اپنی غرض پڑی تو میرا خیال آ گیا۔''

وہ اور شدت سے روتے ہوئے بولی۔

''اُنہوں نے میرا مان توڑ دیا ہے۔ میں ساری زندگی ان سے دور رہ کر بھی اُن کے لیے اچھے جذبات رکھتی تھی۔ ہمیشہ دُعا گو رہی کہ میرا باپ جہاں رہے، خوش رہے لیکن انہوں نے.....''

''بیٹا! ممانی جان نے اُس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ ''یہ واقعی دکھ کی بات ہے، لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''چلو یوں رو رو کر ہلکان مت ہو، اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو، اُٹھو میری بچی!''

نانی اماں نے چمکارتے ہوئے کہا تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو نانی اماں اور ممانی جان سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر فوراً خاموش ہو گئیں۔ اور اب وہ نادان نہیں تھی۔ سمجھ گئی کہ دونوں ابو جی کی حرکت پر تبصرہ کر رہی ہوں گی اور ساتھ ہی ملامت بھی۔ وہ چُپ چاپ ان کے درمیان بیٹھ گئی تو ممانی جان اس خیال سے کہ کہیں دوبارہ نہ یہ موضوع چھڑ جائے، اُس سے پوچھنے لگیں۔

''یہ بتاؤ، دوپہر کے کھانے میں کیا کھاؤ گی۔''

''کچھ بھی نہیں، میرا مطلب ہے جو بھی پک جائے گا بلکہ آپ مجھے بتائیں میں پکاؤں گی۔''

''نہیں بیٹا! صبح بھی تم اتنی دیر تک کچن میں کھڑی رہی ہو۔ اب اپنی نانی اماں کے پاس آرام سے بیٹھو۔''

''ممانی جان! مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا کہ میں تو آرام سے بیٹھی رہوں اور آپ کھانا پکانے میں لگی رہیں۔''

''تم نے بھی تو مجھے بہت آرام پہنچایا ہے۔''

ممانی جان محبت سے اُس کا گال چُھو کر بولیں۔ پھر اُٹھ کھڑی ہوئیں اور جانے کو تھیں کہ اُس نے پکار لیا۔

''ممانی جان! میں اپنے حالات سے سمجھوتا کر چکی ہوں۔ آپ سے اور نانی اماں سے اتنی گزارش ہے کہ ان باتوں کا علم ماموں جان اور سرمد کو نہ ہونے پائے۔'' ممانی جان کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہیں، پھر پُرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

شام میں جنید خان کا فون آیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ وہ مزید دو دن یہاں رُکیں گے۔ اور اُس سے پوچھا کہ اسے اپنے ماموں جان کے گھر میں کوئی تکلیف تو نہیں۔ اُس نے اپنی طرف

سے انہیں پورا اطمینان دلایا اور جب فون رکھ کر پلٹی تو سرمد اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ اسے وہاں کھڑے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''کس کا فون تھا؟''

''جنید خان کا۔'' وہ مختصر جواب دے کر جانا چاہتی تھی کہ وہ سامنے آ گیا۔

''اُس بڈھے کو تمہارے بغیر چین نہیں ہے۔''

''سرمد!'' اس نے ٹوکا۔ ''اب اگر تم نے خان صاحب کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے تو میں ماموں جان سے تمہاری شکایت کر دوں گی۔''

''کیا کہو گی اُن سے؟'' وہ مسکراہٹ دبا کا بولا۔

''تمہارا سر!'' وہ چڑ کر بولی اور پلٹ کر دوسرے راستے سے جانا چاہتی تھی کہ وہ پھر سامنے آ گیا۔

''خفا کیوں ہوتی ہو!''

''تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟''

''چلو معاف کر دو۔'' وہ باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''یہ بتاؤ کیا کہہ رہے تھے تمہارے خان صاحب؟''

''کوئی خاص بات نہیں، بس کہہ رہے تھے ابھی دو دن یہیں رُکیں گے۔''

''تم تو ابھی رہو گی ناں۔''

''نہیں، میں ان کے ساتھ ہی واپس جاؤں گی۔''

''اتنی جلدی!''

اپنے لہجے کی بے اختیاری، بے قراری کو خود ہی محسوس کر کے فوراً سنبھلتا ہوا بولا۔

''میرا مطلب ہے، جب آ ہی گئی ہو تو کچھ دن رہو، اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''کیا کروں گی یہاں رہ کر؟''

''وہاں کیا کرتی ہو؟''

''کچھ نہ بھی کروں، پھر بھی وہاں میری ضرورت ہے۔'' پھر جیسے اپنے آپ سے بولی۔ ''میرے آنے سے بنٹی کتنا اکیلا ہو گیا ہو گا۔''

''یہ بنٹی کون ہے؟'' وہ پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھا، جب ہی اُس کی اپنے آپ سے کی گئی بات سُن لی۔

''خان صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔''

''بہت چھوٹا، میرا مطلب ہے گود کا بچہ ہے؟''

''ارے نہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔ پھر اُس کے ساتھ برآمدے سے اُتر کر آنگن میں آتے ہوئے اُسے بنٹی کے بارے میں بتانے لگی۔

''ایک بات کہوں، بُرا تو نہیں مانو گی۔'' وہ بنٹی کے بارے میں سُن کر کہنے لگا۔ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''مجھے لگتا ہے خان صاحب نے صرف بنٹی کے لیے تم سے شادی کی ہے، ورنہ اس عمر میں انہیں کیا ضرورت تھی بھلا۔'' اس کا اپنا بھی یہی خیال تھا، اس کے باوجود اس کی تردید کر دی۔

''نہیں خیر! ایسی بات تو نہیں ہے، مجھے خود ہی بنٹی کا خیال رہتا ہے۔'' اس کے بغور دیکھنے پر نظریں چُراتے ہوئے بولی۔

''اگر ایسی بات ہوتی تو خان صاحب مجھے اپنے ساتھ لے کر کیوں آتے، اس کے پاس چھوڑ دیتے۔''

''یہ تو ہے۔'' صاف لگ رہا تھا وہ محض اس کی بات رکھنے کی خاطر ایسا کہہ رہا ہے، جب ہی وہ موضوع بدل گئی۔

''سنو، اگر اس وقت تمہارا کہیں جانے کا پروگرام نہیں ہے تو مجھے طارق روڈ لے چلو۔''

''کیا کرو گی؟'' اس نے شاید بے خیالی میں پوچھ لیا۔

''ظاہر ہے شاپنگ۔''

''اچھا۔ ہاں!'' وہ اپنی بے خبری پر ہنسا۔ پھر فوراً اُٹھتا ہوا بولا۔ ''مجھے لے جانے پر اعتراض نہیں ہے لیکن اگر تمہارے خان صاحب نے کہیں راستے میں دیکھ لیا تو؟''

''تو کیا ہوا۔ وہ کیا کہیں گے بھلا۔''

''سوری، میں بھول گیا تھا۔ یہ خوف تو ہم مڈل کلاس والوں کو ہوتا ہے۔'' اس کے شاکی نظروں سے دیکھنے پر شانے اُچکا کر بولا۔

''چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

''میں بس تیار ہی ہوں۔ تم البتہ چینج کر لو، میں جب تک نانی اماں اور ممانی جان سے کہہ دوں۔''

اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ نانی اماں اور ممانی جان سے کہہ کر اپنا پرس اُٹھایا اور واپس آئی تو وہ صرف شرٹ چینج کر کے بٹن بند کرتا ہوا آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر باہر کی طرف چل پڑا تو وہ بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چلی آئی۔

☆☆☆

دو دن پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ تیسرے دن صبح ابھی وہ ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ جنید خان کا فون آ گیا۔ انہوں نے پہلی بات واپسی کی کہی پھر شاید مروتاً اس سے پوچھنے لگے تھے۔

''تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اگر مزید یہاں رہنا چاہو تو.....''

''نہیں خان صاحب! میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گی۔'' وہ فوراً بول پڑی۔

''گڈ!'' وہ جیسے خوش ہو گئے۔

''آپ یہاں آئیں گے، میرا مطلب ہے مجھے لینے۔'' وہ پوچھنے لگی۔

''سوری ڈیئر! میں بالکل فارغ نہیں ہوں۔تم چار بجے تک اپنے کزن کے ساتھ ہوٹل آجانا۔''

''جی بہتر۔''اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور فون رکھ کر نانی اماں کے پاس چلی آئی۔ انہیں اپنی واپسی کا بتایا تو وہ خفگی سے بولیں۔

''یہاں کیا آگ اٹھانے آئی تھیں۔''

''نہیں، آپ سے ملنے۔''وہ اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''صرف دو دن کے لیے۔میں تو ابھی تمہیں دل بھر کر دیکھ بھی نہیں پائی۔''

''میں پھر آؤں گی نانی اماں!''وہ ان کے بوڑھے ہاتھ اپنے گالوں سے لگاتے ہوئے کہنے لگی۔''ابھی تو میں کیونکہ بغیر پروگرام کے آئی تھی، اس لیے جلدی جا رہی ہوں۔پھر آؤں گی تو بہت سارے دن رہوں گی۔''

''پھر پتہ نہیں کب آؤ گی۔''

''جب آپ بلائیں گی، بلکہ ایسا کریں سرمد کی شادی کر ڈالیں، پھر تو میں ضرور آؤں گی۔''

''میں بلاؤں گا تب ناں۔''وہ جو اندر آ رہا تھا، اس کی آخری بات سن کر کہنے لگا۔

''کیا مطلب!''وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔''کیا تم مجھے اپنی شادی میں نہیں بلاؤ گے۔''

''ہرگز نہیں۔''

''کیوں؟''

''میری مرضی۔''

''بیٹا! تم کس سے اُلجھنے لگیں۔جانتی تو ہو، یہ تمہیں تنگ کرتا ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمد کی شادی ہو اور تمہیں نہ بلایا جائے۔''نانی اماں نے کہا تو وہ اُسے گھورنے لگی۔

''کچا کھانے کا ارادہ ہے کیا؟''وہ اُس کے گھورنے پر شرارت سے بولا۔

''بکو مت! اور سنو، آج جلدی آجانا۔مجھے چار بجے ہوٹل پہنچنا ہے۔''

''خیریت!''

''ہاں، ابھی خان صاحب کا فون آیا تھا۔آج ہم واپس جا رہے ہیں۔''

''تو کیا جنید خان یہاں نہیں آئیں گے۔''

''نہیں۔انہیں فرصت نہیں ہے۔''

''تو فون کر کے انہیں کہہ دو کہ مجھے بھی فرصت نہیں ہے۔اور نہ ہی میں ان کا ملازم ہوں کہ ان کے کہنے پر تمہیں لانے اور لے جانے کی ڈیوٹی انجام دیتا پھروں۔''

''سرمد!''وہ اُس کے اچانک موڈ بدلنے پر حیران ہوئی۔

''تم اُن کی بیوی ہو، اُن کی ذمہ داری ہو نہ کہ میری۔''

اس کے ساتھ ہی وہ پیر پٹختا ہوا کمرے اور پھر گھر سے ہی نکل گیا۔وہ کچھ دیر تک اُس کے پیچھے نظریں دوڑاتی رہی۔پھر طویل سانس لے کر نانی اماں کے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اور اپنی ہتھیلیوں پر نمی محسوس کر کے نانی اماں اُس پر جھک گئیں۔

''بیٹا! اس کی باتوں کا بُرا مت منانا۔''

''مجھے بُرا نہیں لگا نانی اماں! اور پھر وہ غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔''

آنسوؤں کی آمیزش اس کے لہجے میں بھی سمٹ آئی تھی۔

''پھر رو کیوں رہی ہو؟''

''میں رو تو نہیں رہی۔''

اُس نے مسکرانے کی کامیاب کوشش کی اور آنکھوں پر سے نانی اماں کے ہاتھ ہٹا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔اس سے وہ نانی اماں کو چھوٹی سی معصوم بچی کی طرح لگی جو اپنی کسی بھی کوشش میں کامیاب ہو کر فخریہ انداز میں داد طلب نظروں سے دیکھتی ہے، انہوں نے اس کی پیشانی چوم

لی۔

''اپنے ماموں جان سے کہنا، وہ تمہیں چھوڑ آئیں گے۔''

''میرا جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے نانی اماں! میں اکیلی بھی جا سکتی ہوں، خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں ممانی جان نے سرمد کے لیے کوئی لڑکی بھی دیکھی یا نہیں۔''

وہ خوبصورتی سے بات بدل گئی، ساتھ ہی موڈ بھی۔

''لڑکیاں تو کئی ایک نظر میں ہیں لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' وہ فوراً پوچھنے لگی۔

''سرمد ابھی راضی نہیں ہے۔''

''کیوں! کیا کہتا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ بس ابھی نہیں، ابھی نہیں کی رٹ لگا دیتا ہے۔ پتہ نہیں کیا چاہتا ہے'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ ''اتنا ارمان ہے اس کی شادی کا۔ کم از کم میرا ہی خیال کرے، بوڑھی جان ہوں، زندگی کا کیا بھروسہ! آج ہوں کل نہیں۔''

''ارے نہیں نانی اماں! ابھی آپ کو بہت جینا ہے۔ سرمد تو کیا اس کے بچوں کی شادیاں بھی دیکھنی ہیں۔''

اور شاید بچوں کے ذکر پر ہی نانی اماں کو یاد آیا تو اس سے پوچھنے لگیں۔

''سنو! تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''یہی چار پانچ مہینے۔''

''پانچ مہینے!'' نانی اماں کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگیں۔

''یہ کوئی اتنا زیادہ عرصہ تو نہیں ہے، پھر بھی تم کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔''

''کیوں؟'' وہ بالکل نہیں سمجھی۔

''بچے کے لئے!''

''بچہ!'' ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی دل میں ممتا کا میٹھا میٹھا احساس جاگنے

''ہاں بجو! تم اس سلسلے میں لاپروائی مت کرنا۔'' نانی اماں اسے سمجھانے لگیں۔

''ایسی صورت میں جبکہ جنید خان کے بچے موجود ہیں، تمہیں غافل نہیں ہونا چاہیے۔ جنید خان کا کیا بھروسہ۔ ہو سکتا ہے اُسے مزید بچے کی آرزو نہ ہو۔''

نانی اماں کی بات سمجھ کر اُس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر چلا گیا۔ اور نانی اماں کہہ رہی

ا۔

''عورت کی تکمیل ماں بننے سے ہی ہوتی ہے۔ اللہ نہ کرے جو تم ادھوری رہو۔ اور پھر ے لیے تو اور بھی ضروری ہے کیونکہ جنید خان بڑا آدمی ہے۔ اگر تمہاری اولاد نہ ہوئی تو ساری اداس کی پہلی اولادیں لے جائیں گی اور تم.....''

''نانی اماں!'' اس نے ٹوک دیا۔ ''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ!''

''میں غلط نہیں کہہ رہی۔ تمہیں آنے والے حالات سے آگاہ کر رہی ہوں۔ تم ابھی ہو۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

''دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ خدانخواستہ کل کو جنید خان کو کچھ ہو جائے تو اس گھر میں ری جگہ نہیں رہے گی اور تم کہہ رہی تھیں کہ اس کی اولادیں تم سے بھی بڑی ہیں تو ایسی صورت ؤ وہ تمہیں کھڑے کھڑے نکال باہر کریں گے۔ ہاں اگر جائداد کا حصہ پیدا کر لو تو پھر کسی کی مجال ا، جو تمہیں کچھ کہہ سکیں۔''

وہ کچھ خوفزدہ ہو گئی اور یقیناً اس وقت کا تصور کر کے اندر ہی اندر دہلنے لگی تھی۔

''اللہ نہ کرے جو جنید خان کو کچھ ہو۔'' وہ سہم کر بولی۔

''ہاں بیٹا! وہ تمہارا سہاگ ہے۔ اللہ اسے سلامت رکھے، پھر بھی۔''

''بس نانی اماں!'' اس میں مزید کچھ سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لیے اُٹھ کر اپنا بیگ

ٹھیک کرنے لگی۔

پھر کچھ وقت اس نے اپنے آپ کو بہت مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ کچن میں جا کر ممانی جان کے منع کرنے کے باوجود کھانا پکانے میں ان کے ساتھ لگی رہی۔ اصل میں نانی اماں کی باتوں نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اور وہ ان کے پاس سے اُٹھ تو آئی تھی لیکن ذہن مسلسل اُلجھا ہوا تھا۔ ممانی جان سے باتیں کرتے ہوئے بھی وہ ایک دم خاموش ہو جاتی۔ ابھی پتہ نہیں انہوں نے کیا کہا تھا۔ اس نے سُنا ہی نہیں۔ بس چُپ چاپ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تو پھر تم سرمد سے بات کرو گی ناں۔'' ممانی جان نے کہا تو وہ چونک گئی۔

''کیا بات؟''

''شادی کی، اس سے کہو شادی کر لے۔ تمہارے جانے سے جو یہ گھر سونا سونا ہو گیا ہے، اُس کی دلہن کے آنے سے پھر رونق ہو جائے گی۔''

''میری بات کہاں مانتا ہے وہ۔'' اس نے دامن بچانا چاہا۔

''تم کہہ کر تو دیکھو، ہو سکتا ہے مان لے۔''

''اچھا! لیکن اب میری اس سے ملاقات کہاں ہو گی۔ وہ تو شام میں آئے گا۔ جبکہ مجھے تین بجے یہاں سے نکل جانا ہے۔'' اسے اچانک اس کی صبح والی باتیں اور رویہ یاد آیا، تو معذوری ظاہر کرنے لگی۔

''شام میں کیوں آئے گا۔ اسے معلوم ہے کہ آج تم نے جانا ہے۔ یقیناً دوپہر تک آ جائے گا اور پھر تمہیں چھوڑنے بھی تو جائے گا۔''

''نہیں، صبح وہ منع کر گیا تھا۔ کہہ رہا تھا، میں تمہارا نوکر نہیں لگا ہوا۔''

''اچھا!'' ممانی جان ہنس پڑیں۔ ''یونہی مذاق میں کہہ گیا ہو گا۔''

''نہیں ممانی جان وہ سنجیدہ تھا۔''

''ارے نہیں بیٹا! تم دیکھنا، وہ ضرور آئے گا۔ سنجیدہ تو وہ زندگی میں کبھی ہوا ہی نہیں۔''

ممانی جان نے یقین سے کہا اور وہ واقعی دوپہر کے کھانے پر موجود تھا۔ اُس کا دل چاہا
ں تو فرصت نہیں تھی پھر کیسے آ گئے۔ لیکن وہ کچھ اتنا سنجیدہ اور لاتعلق سا نظر آ رہا تھا کہ اُس
ہی نہ پیدا ہوئی۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تو وہ بھی کچھ دیر آرام کی غرض
اماں کے پاس لیٹ گئی۔ ممانی جان بھی وہیں آ گئی تھیں۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت
نے کا پتہ ہی نہ چلا۔ ٹھیک تین بجے آ کر وہ کچھ روٹھے روٹھے لہجے میں بولا۔

''چلو! تمہیں چھوڑ آؤں۔'' وہ اب بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن ممانی جان کا خیال
خاموشی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا بیگ لا کر سامنے رکھا۔ پھر ممانی جان اور نانی اماں سے مل
ی ڈھیروں دعائیں لیے اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔

''یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارا یا جنید خان کا خیال کر کے آیا ہوں۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا
۔ ''مجھے ابو جی نے تاکید کی تھی اس لیے چلا آیا۔''

''شکریہ۔'' وہ مصالحت پر آمادہ تھی۔ اس لیے مسکرا کر شکریہ کہا تو وہ بھی زیادہ دیر اپنا
اب نہ رکھ سکا۔

''پھر کب آؤ گی؟''

''تمہاری شادی پر۔''

''یقیناً امی نے تمہیں کہا ہو گا کہ مجھے شادی پر آمادہ کرنا۔'' اسے حیرت تو ہوئی لیکن ظاہر
لیا۔ انجان بن کر پوچھنے لگی۔

''کیوں، کیا تم شادی کے لیے آمادہ نہیں ہو؟''

''شادی کروں گا لیکن ابھی نہیں۔''

''ابھی کیوں نہیں؟''

''بس میری مرضی۔ اور اب خدا کے لیے اس موضوع پر بات مت کرنا۔''

وہ اُکتا کر بولا تو وہ کندھے اُچکا کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

''سنو! اب میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ بالکل خاموش ہو جاؤ۔ تم کسی اور موضوع پر بات کر سکتی ہو۔'' وہ اُسے مسلسل شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے بولا تو وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

''کبھی لاہور آؤ ناں۔ میرا مطلب ہے ہمارے گھر۔''

''وعدہ تو نہیں کرتا۔ ہاں اگر لاہور آنا ہوا تو پھر تمہارے پاس بھی ضرور آؤں گا۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

پھر ہوٹل سے باہر ہی گاڑی روک کر پچھلی سیٹ سے اُس کا بیگ اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

''خدا حافظ۔''

''کیا مطلب؟ کیا تم یہیں سے واپس چلے جاؤ گے۔'' وہ اُس کی بے مروتی پر حیران ہو کر بولی۔

''ہاں۔''

''نہیں سرمد! یہ اچھا نہیں لگتا۔ خان صاحب کیا سوچیں گے۔''

''خان صاحب کی بہت فکر ہے تمہیں۔'' وہ چڑ گیا۔

''کیا نہیں ہونی چاہیے۔'' شاید وہ کوئی غلط بات کہنے جا رہا تھا کہ فوراً ہونٹ بھینچ کر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر گیا۔ پھر اس کے ساتھ اوپر آیا تو بس کچھ دیر ہی جنید خان کے پاس بیٹھا۔ اس کے بعد اپنے کسی کام کا بہانا کر کے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

وہی گھر تھا جہاں تین دن پہلے تک وہ حالات سے سمجھوتا کر کے بہت حد تک مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ بس کبھی کبھی یہ خیال اسے آزردہ کرتا کہ اس سے اتنی محبت کرنے والی ہستیوں نے آخر میں دودھ کی مکھی کی طرح اسے نکال پھینکا۔ ورنہ تو ہر طرح کا اطمینان ہی تھا۔ اور اب جبکہ صرف تین دن کے بعد دوبارہ اس گھر میں آئی تو ہر شے اجنبی لگ رہی تھی۔ حالانکہ سب کچھ ویسا ہی

تھا۔

اس نے غور کیا تو اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ تبدیلی تو خود اس میں آئی تھی۔ اس کبھی کبھار کے خیال کی جگہ دل میں ایک کسک اور خلش جاگ اُٹھی تھی کہ جب زندگی کی ناؤ کو اس کی خواہش کے عین مطابق من پسند کنارا مل رہا تھا تو پھر امی ابو نے کسی طوفان کی طرح آ کر اس کا رُخ کیوں موڑ دیا۔

حیرت اسے سرمد پر بھی تھی کہ اس نے ان تین دنوں میں ایک بار بھی گزشتہ زندگی کی کسی بات کو دہرایا نہیں تھا۔ اور کچھ نہیں تو اس پر بے وفائی کا الزام تو رکھ ہی سکتا تھا لیکن اس نے تو اپنے کسی انداز سے بھی ظاہر نہیں کیا کہ وہ کبھی اس کے سامنے اپنے جذبوں کو بے نقاب کر چکا ہے۔ اور کمال ضبط کا مظاہرہ تو وہ بھی کر گئی تھی کہ ساری حقیقت جاننے کے بعد بھی اس کا سامنا کیا۔ اور یہی نہیں بلکہ نانی اماں اور ممانی جان پر بھی یہی ظاہر کیا کہ وہ ان حالات کو نہ صرف مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی ہے بلکہ مطمئن بھی ہے۔ اور اب یہاں آ کر وہ پچھلے کئی دنوں سے اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ کیا واقعی وہ مطمئن ہے۔ جواب میں دل دہائیاں دینے لگتا تو وہ گھبرا جاتی۔ پریشان ہو کر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتی کہ اب جبکہ زندگی مخصوص راستوں پر چلنے لگی ہے تو وہ کیوں گزشتہ راستوں کو کھوجنے لگی ہے۔

کئی بار سوچا کہ ابو جی یا پھر آنٹی سے جا کر پوچھے کہ انہوں نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اپنے مفاد کی خاطر اسے ان محبت کرنے والی ہستیوں سے کیوں کھینچ لائے۔ لیکن ہمیشہ وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ ابو جی کے گھر جانا بالکل ہی چھوڑ دیا۔

ان دنوں بنٹی اسے خاص طور سے نوٹ کر رہا تھا کہ وہ کچھ اُلجھی اُلجھی سی رہتی ہے۔ کبھی بے تحاشا بولتی جیسے اپنے اندر کی آوازوں کو دبانا چاہتی ہو۔ اور کبھی ایک دم خاموش، جیسے اندر کی آوازوں کو دباتے دباتے تھک کر خود انہی میں کہیں کھو گئی۔

''آخر آپ کی پرابلم کیا ہے؟'' اس روز اس کی مسلسل خاموشی سے تنگ آ کر وہ پوچھنے

لگا۔

''کون سی پرابلم؟'' وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اس کا مطلب ہے، ایک نہیں کئی پرابلمز ہیں۔''

''پتہ نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''میرا خیال ہے، آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔''

''نہیں بھئی، میں بالکل نہیں سمجھ رہی۔''

''اچھا۔'' وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے آپ کراچی سے ہو کر آئی ہیں، بہت اَپ سیٹ رہنے لگی ہیں۔ اور پوچھنا یہ ہے کہ آخر وہاں ایسی کیا بات ہوئی ہے جس نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے۔''

''ارے! یہ بنٹی تو بہت تیز ہے۔'' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا اور فوراً اپنے آپ پر قابو پاتی ہوئی مسکرا کر بولی۔

''تمہارا وہم ہے بنٹی! ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، میں بالکل بھی پریشان نہیں ہوں۔''

''چلیے مان لیتا ہوں، لیکن پلیز آپ اتنی خاموش نہ رہا کریں، مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔''

''پہلے میں زیادہ تو نہیں بولتی تھی۔''

''ہاں! لیکن سُنتی تو تھیں۔ میرا مطلب ہے توجہ سے۔ آپ میری طرف متوجہ رہتی تھیں۔ اور اب ایسا لگتا ہے جیسے آپ صرف جسمانی طور پر میرے پاس موجود ہوں اور آپ کا ذہن.....''

''آئی ایم سوری بنٹی!'' وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔ ''میں ان دنوں واقعی تمہاری

طرف توجہ سے نہیں سُن رہی تھی۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟'' وہ شاید ہر صورت جاننا چاہتا تھا۔ اور وہ اسے مطمئن کرنے کی غرض سے بولی۔

''اصل میں تمہارے ڈیڈی کی طرف سے فکر مند ہوں، اتنے مصروف رہتے ہیں۔ روقت کام کام اور جتنا کام کرتے ہیں، اس حساب سے آرام بالکل بھی نہیں۔ تم نے دیکھا نہیں ن کی صحت کتنی متاثر ہو رہی ہے۔''

اس نے بنٹی کو مطمئن کرنے کی غرض سے اور اپنی طرف سے اسکی توجہ ہٹانے کی خاطر یہی بات بنائی تھی کہ اچانک نانی اماں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ انہوں نے کہا تھا۔

''خدانخواستہ جنید خان کو کچھ ہو گیا تو اس گھر میں تمہاری جگہ نہیں رہے گی۔ البتہ جائیداد کا حصہ پیدا کر لو تو۔''

اور پھر

''اللہ نہ کرے جو تم ادھوری رہو۔''

اچانک اسے اپنے خالی پن کا احساس ہونے لگا تو وہ خاموشی سے بنٹی کے پاس سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کتنی دیر تک وہ اس نہج پر سوچتی رہی تھی۔

اس کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ بس صرف سات ماہ اور اگر حالات ایسے نہ ہوتے تو شاید ابھی وہ نئے مہمان کے بارے میں سوچتی بھی نا۔ لیکن اب نانی اماں کی باتوں نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے جائیداد کا لالچ نہیں تھا۔ البتہ وہ اپنی تکمیل ضرور چاہتی تھی۔ اسی رات جنید خان کے سامنے اس نے خاص طور سے بچوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ ان کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی۔ اور جاننا چاہتی تھی کہ آیا وہ مزید بچوں کی آرزو رکھتے ہیں یا نہیں۔ اور اسے بہت مایوسی ہوئی۔ جب انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر اگلے کئی دن تک وہ انہیں آزماتی رہی۔ کبھی بچوں کی باتیں اور کبھی بچوں کی کوئی مووی لگا دیتی۔ اور جنید خان پتہ نہیں سمجھ نہیں رہے تھے یا جان بوجھ کر

انجان بن رہے تھے۔ بہر حال وہ خاصی دلبرداشتہ ہوئی۔ اور ایک آخری خواہش کے طور پر اُن سے صاف بات کرنے کی جُرات کر بیٹھی۔

''خان صاحب! میں اپنی تکمیل چاہتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''میں!'' وہ ہچکچائی تھی۔ ''میرا مطلب ہے، میں ماں بننا چاہتی ہوں۔''

''ارے!'' جنید خان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ ''میری بیوی بنتے ہی تم نہ صرف ماں بلکہ نانی اور دادی بھی بن گئی تھیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے خان صاحب! لیکن میں اپنے بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں، جو میری کوکھ سے جنم لے اور میری آغوش میں پرورش پائے۔''

''کم آن سویٹی!'' انہوں نے ٹوکا۔ ''صرف اپنے بارے میں نہیں، میرے بارے میں بھی سوچو۔ اب اس عمر میں میں شیر خوار بچے کا باپ کہلاتا اچھا لگوں گا کیا؟'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''فریحہ پہلے ہی خفا ہے کہ میں نے اس عمر میں شادی کیوں کی۔ اب اگر بچے پیدا کرنے لگوں تو.....''

''صرف ایک۔'' وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔

''امپاسیبل!'' پیشانی شکن آلود اور لہجے کی سختی نے اسے نہ صرف اندر تک دہلا دیا بلکہ باور بھی کرا دیا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی بات نہ اب نہ آیندہ کبھی نہیں سنیں گے۔ وہ سر جُھکا کر اپنے اندر ہمکتے مامتا کے جذبے کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ وہ کہنے لگے۔

''سنو! تمہیں صرف ماں بننے کی خواہش ہے یا میری جائیداد میں حصہ دار پیدا کرنا چاہتی ہو؟''

''میرے خدا!'' اسے حیرت کے ساتھ دُکھ بھی ہوا۔ تاسف بھری نظروں سے دیکھتی

وئی بولی۔

''مجھے جائیداد میں سے کچھ نہیں چاہیے خان صاحب! بس ایک بچہ جو میری مامتا کا سہارا ہو۔ میرا یقین کریں، میں اپنے لیے اور اس کے لیے کچھ نہیں مانگوں گی۔''

''اچھا۔'' وہ پتہ نہیں کیوں ہنسے تھے۔ ''تمہیں شاید پیسے کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے۔ بہر حال میں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔''

وہ کروٹ بدل گئے۔ اور وہ بقیہ تمام رات آنکھوں پر بند باندھتی رہی۔

جنید خان نے اسے اندھیرے میں نہیں رکھا تھا، نہ ہی اس کا دل رکھنے کی خاطر کوئی آس دلائی تھی بلکہ انہوں نے واضح الفاظ میں اس کی خواہش رد کر دی تھی۔ اور ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ہر بات کی طرح اسے بھی نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتی۔ لیکن اس کے برعکس وہ کسی طرح بھی اس تلخ حقیقت کو قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ گو کہ کوشش ضرور کر رہی تھی کہ اپنے اندر ہمکتے مامتا کے جذبے کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دے۔ لیکن جتنا وہ اس جذبے کو دباتی، اتنا زیادہ وہ سر اُبھارتا۔ اور وہ بے چین ہو جاتی۔

کوئی معصوم فرشتہ، کوئی ننھا منا سا وجود اس کی آغوش میں سمائے تو اسے اپنا آپ معتبر لگے۔

''کیا وہ کبھی معتبر نہیں ہو گی؟'' وہ سوچتی۔

کیا اس کی سماعتیں ہمیشہ ایک لفظ ماں سننے کو ترستی رہیں گی۔

کوئی تو ہو جو میرے تڑپتے مچلتے جذبے کو فقط ایک لفظ سے شانتی بخش دے۔

اور پھر وہ سکون ڈھونڈتی ہوئی بنٹی کے پاس جا بیٹھی۔ اس اتنے بڑے گھر میں ایک وہی تو تھا جو اپنی کہتا تو اس کی بھی سنتا تھا۔ اس کی وہیل چیئر کے آگے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور اس کے مضبوط ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتی ہوئی بولی

''سنو بنٹی! تمہیں یاد ہے اول روز تم نے پوچھا تھا کہ تم مجھے کیا کہہ کر مخاطب کیا کرو۔''

''ہاں اور شاید آپ نے کہا تھا جو بھی نام دو لیکن اتنا خیال رکھنا کہ میری عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔'' وہ سوچتا ہوا بولا۔

''ہاں۔ میں نے ایسا ہی کہا تھا۔ پھر تم نے مجھے کوئی نام کیوں نہیں دیا؟''

''بس یونہی۔'' وہ اس کی حالت سے بے خبر لاپروائی سے بولا۔

''یونہی!!'' ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی وہ اس کی طرف دیکھے گئی۔ وہ کوئی ننھا منا سا معصوم فرشتہ نہیں تھا جو اس کی آغوش میں سما جاتا۔ اور جسے وہ سینے میں بھینچ کر مامتا کی پیاس بجھاتی۔ وہ تو بس اس سے چند برس ہی چھوٹا تھا۔ پھر بھی اس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بولی۔

''سنو! تم مجھے ماں کیوں نہیں کہتے؟''

''ماں!'' وہ شاید ہنسنا چاہتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں ہنس نہیں سکا۔

''ہاں بنٹی! تم مجھے ممی کہو یا مما یا ایسا ہی کوئی لفظ جو تمہیں اچھا لگے۔''

''اچھا!'' وہ ہلکے سے مسکرایا۔ ''مجھے آپ کو مما کہنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' وہ بے تابی سے بولی۔

''آپ میری مما لگتی نہیں ہیں۔''

''تمہاری مما تو بہت خوبصورت ہوں گی۔'' وہ غیر ارادی طور پر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھونے لگی۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' وہ اس کی حرکت سے محظوظ ہو کر بولا۔

''میرا مطلب ہے عمر میں آپ مجھ سے اتنی بڑی نہیں ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' وہ جلدی سے بولی۔ ''ہوں تو میں تمہاری مما اور جب تم اس رشتے کو تسلیم بھی کر رہے ہو تو پھر مما کہنے میں کیا حرج ہے۔''

''آپ کو بُرا نہیں لگے گا؟''

''نہیں بھئی، میں خود تم سے کہہ رہی ہوں اور مجھے بہت اچھا لگے گا۔''

''اچھا تو مما جی! اب آپ یہاں سے اُٹھ کر اوپر بیٹھیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ میری ماں میرے پیروں کے پاس بیٹھی ہے۔''

وہ اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھانے کی کوشش کرتا ہوا بولا تو وہ یکدم بے اختیار ہو گئی۔ اس کے ہاتھ تھام کر کبھی ہونٹوں سے لگاتی اور کبھی آنکھوں سے۔ اور بنٹی اس کی کیفیت اور والہانہ انداز پر حیران ہو رہا تھا۔

اُس نے زندگی میں کبھی بہت زیادہ کی آرزو نہیں کی تھی۔ بس جو مل گیا اسی پر قناعت کرتی۔ ہو سکتا ہے قناعت کرنا اس کی مجبوری رہی ہو۔ کیونکہ دنیا میں واحد ہستی ابو جی جن پر وہ حق رکھتی تھی اور انہوں نے کبھی اس کی خبر نہیں لی۔ جو خبر گیری کرتے تھے، ان پر ابو جی جتنا حق بہر حال نہیں تھا۔ اس لیے ان کی طرف سے جو مل گیا، اسے ہی بہت سمجھ لیا۔ اور اب بنٹی پر بھی اسے اتنا حق نہیں تھا جتنا کہ اپنی پیٹ کی اولاد پر حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی طرف سے محبت کے چند بولوں کو اس نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ پتہ نہیں اس کی مامتا کے تڑپتے مچلتے جذبے کو تسکین ملی تھی کہ نہیں، لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ مطمئن ہونے لگی تھی کہ چلو کوئی ماں کہنے والا تو ہے۔

کیا ہوا جو وہ اسے جنم دینے کی سزاوار نہیں ہوئی!

کیا ہوا جو وہ اسے اپنی آغوش میں نہیں سمیٹ سکتی!

اور۔

کیا ہوا جو اس کی آبیاری اس نے اپنے لہو سے نہیں کی!

یہی بہت ہے کہ اس نے ماں کہہ کر ادھورے پن کے احساس کو مٹا دیا ہے۔ ان دنوں وہ کچھ مگن سی ہو کر بنٹی کی ناز برداریوں میں مصروف تھی، جبھی اس نے غور ہی نہیں کیا کہ جنید خان کچھ تھکے تھکے سے رہنے لگے ہیں۔ وہ جو اپنی عمر سے دس سال کم نظر آتے تھے، اب اتنے ہی برس آگے جا کھڑے ہوئے ہیں۔

اس روز وہ جنید خان کے آفس جانے کے بعد بنٹی کے ساتھ بیٹھی کوئی مووی دیکھ رہی تھی کہ فون کی بیل سُن کر اٹھ کھڑی ہوئی تو دوسری طرف جنید خان کا پی اے تھا۔ اس نے بتایا کہ جنید خان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ اس وقت ہاسپٹل میں ہیں۔

''کیا ہوا ہے انہیں؟'' وہ ایک دم پریشان ہوگئی۔

اور اس سے ہاسپٹل کا معلوم کر کے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہا۔ اور جلدی سے بنٹی کے پاس آ کر اسے بتانے لگی۔

''سنو بنٹی! تمہارے ڈیڈی ہاسپٹل میں ہیں اور میں ان کے پاس جا رہی ہوں۔'' پریشانی اس کے چہرے اور آواز میں بھی سمٹ آئی تھی جبکہ بنٹی نے بڑے سکون سے اس خبر کو سُنا اور اطمینان سے کہنے لگا۔

''کم آن مما! وہ یونہی چیک اپ کے لیے گئے ہوں گے۔''

''نہیں بنٹی! ان کے پی اے کا فون تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔''

''اچھا!'' اس نے پھر بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ ''کام کی ٹینشن ہوگی اور پلیز آپ اتنی پریشان نہ ہوں۔''

وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ ڈرائیور گاڑی لیے منتظر تھا۔ وہ اسے ہاسپٹل کا بتا کر بیٹھ گئی۔ جنید خان کے پاس پہنچی تو انہوں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر پوچھنے لگے۔

''تم یہاں کیسے آئیں؟ میرا مطلب ہے تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟''

''آپ کیسے ہیں خان صاحب؟'' وہ ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''ایک دم فرسٹ کلاس!'' پتہ نہیں، انہوں نے لہجے کو فریش رکھنے کی کامیاب کوشش کی تھی یا واقعی وہ اتنے فریش تھے، وہ سمجھ نہیں سکی۔

''کیا ہوا ہے آپ کو؟'' وہ اب بھی پریشان تھی۔

''کچھ نہیں، بس سینے میں معمولی سا درد تھا تو چیک اپ کے لیے چلا آیا۔''

اسی وقت ڈاکٹر صاحب اندر آئے تو جنید خان کے ساتھ وہ بھی ان کی طرف متوجہ ہوگئی اور ڈاکٹر صاحب آتے ہی کہنے لگے۔

''خان صاحب! اب مزید تاخیر آپ کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ آپ کو فوراً بائی پاس کے لیے لندن جانا چاہیے۔''

جنید خان نے اثبات میں سر ہلایا، پھر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

''ڈاکٹر یونس! ان سے ملیں۔ یہ میری مسز ہیں۔''

''ہاؤ آر یو؟'' ڈاکٹر یونس اس کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے۔

''فائن تھینک یو۔''

''مسز خان! آپ میرے ساتھ آئیں۔'' ڈاکٹر یونس نے کہا تو وہ جنید خان کی طرف دیکھنے لگی، پھر ان کا اشارہ پا کر ڈاکٹر صاحب کے پیچھے چل پڑی۔ ڈاکٹر یونس اسے لے کر اپنے کمرے میں آئے اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''جنید خان اپنی صحت پر بزنس کو ترجیح دے رہے ہیں، انہیں ہارٹ بٹربل کی شکایت ہے۔ اور میں گزشتہ تین ماہ سے انہیں بائی پاس کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اور وہ ہیں کہ آج کل پر ٹالتے جا رہے ہیں۔ آپ پلیز انہیں سمجھائیں مسز خان! کہ مزید تاخیر سخت نقصان دہ ہوگی۔'' وہ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

''میں کچھ میڈیسن لکھ کر دے رہا ہوں یہ پابندی سے استعمال کرائیں اور اس ہفتے مکمل ریسٹ کرائیں۔ کسی قسم کی کوئی ٹینشن نہیں ہونی چاہیے۔ اور اگلے ہفتے انہیں لندن میں ہونا چاہیے۔ میں وہاں کے ڈاکٹرز سے بات کر کے آپ کو مطلع کر دوں گا۔''

بات کے اختتام پر انہوں نے بغور اس کی طرف دیکھا، وہ گم صم بیٹھی تھی۔

''مسز خان!'' انہوں نے متوجہ کیا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''اپنی پرابلم؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''آپ میری بات سُن رہی تھیں۔'' وہ پوچھنے لگے۔

''جی!''

''ذرا بتایئے تو میں نے کیا کہا ہے؟''

''اگلے ہفتے خان صاحب کو لندن میں ہونا چاہیے۔'' اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

''کس سلسلے میں؟''

''بائی پاس کے لیے۔''

''ہاں!'' انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا کہ بظاہر وہ کسی طرح بھی ان کی طرف متوجہ نہیں لگ رہی تھی۔

''اب میں جاؤں؟'' وہ اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ہاں! اور پلیز خیال رکھیے گا خان صاحب کے لیے ریسٹ بہت ضروری ہے۔ میرا یہ خیال تھا کہ وہ یہیں رہتے۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں، میں ان کا خیال رکھوں گی۔'' اس نے یقین دلایا اور ان کے کمرے سے نکل آئی۔

پھر پورا ہفتہ اس نے ڈاکٹر یونس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے جنید خان کو مکمل ریسٹ دیا۔ یہاں تک کہ ان کا پی اے آفس کی کوئی انتہائی ضروری فائل لے کر بھی آتا کہ اس پر جنید خان کے سائن کروانے ہیں تو وہ اسے بھی باہر ہی سے لوٹا دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ فائل ہاتھ میں لیتے ہی جنید خان کو بہت سارے کام یاد آ جائیں گے اور اگر وہ خود نہ بھی گئے تو اس ٹینشن میں ضرور مبتلا ہو جائیں گے کہ پتہ نہیں ان کا وہ کام ہوا کہ نہیں۔ اور کسی بھی قسم کی ٹینشن ان کے لیے سخت نقصان دہ تھی۔ وہ انہیں بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہی تھی کہ بعض اوقات تو وہ جھنجھلا جاتے اور کچھ شائستہ قسم کی گالیوں سے بھی نواز دیتے۔ وہ سب کچھ خاموشی سے سُن لیتی۔ اس دوران وہ انہیں

لندن جانے کے لیے بھی آمادہ کرتی رہی تھی، جس کے لیے وہ پہلے بالکل تیار نہیں تھے۔ محض اپنے بزنس کی وجہ سے اور لندن جانے کو وقت کا زیاں سمجھ رہے تھے۔ بہر حال وہ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور جس روز وہ ان کے ساتھ جانے والی تھی اس روز سرمد کا فون آ گیا۔ اتفاق سے اسی نے ریسیو کیا تھا۔ اور اس کی آواز سنتے ہی وہ کہنے لگا۔

''کیا بات ہے، بہت مصروف رہنے لگی ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''میں پہلے بھی دو تین بار فون کر چکا ہوں۔ لیکن تم سے بات نہ ہو سکی کیونکہ تمہارے ملازم نے تمہیں بلانے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ تم بہت مصروف ہو۔''

''ہاں! اصل میں خان صاحب!'' وہ اپنی مصروفیت کا سبب بتانا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑا۔

''کیا ہوا فوت ہو گئے تمہارے خان صاحب؟''

''اللہ نہ کرے!'' وہ بے اختیار بولی اور بے اختیار ہی رو پڑی۔

''ارے ہیلو ہیلو۔ ہیلو۔''

''تم نے ایسی بات کیوں کہی؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''آئی ایم سوری۔ میں نے تو یونہی مذاق میں۔''

''میں مذاق میں بھی ایسی بات نہیں سُن سکتی۔ سمجھے تم!''

''سُنو! تمہیں کیا خان صاحب سے بہت محبت ہے؟''

''ہاں! اس لیے کہ وہ میرا سہاگ ہیں، میرا سائبان ہیں اور اس سائبان سے نکل کر پوری دنیا میں میرے لیے کہیں امان نہیں۔''

قدرے توقف کے بعد اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''یہ بتاؤ تم نے فون کیوں کیا تھا؟''

''میں ایک کام کے سلسلے میں لاہور آرہا ہوں۔ پوچھنا یہ تھا کہ تم سے ملاقات ہو سکے گی؟''

''تم اگر میرے گھر آنا چاہو تو ضرور آؤ لیکن مجھ سے ملاقات یوں نہیں ہو سکے گی کہ میں آج خان صاحب کے ساتھ لندن جا رہی ہوں۔''

''کس سلسلے میں؟''

''خان صاحب کے بائی پاس کے لیے۔''

''ارے!'' وہ شاید اسے حوصلہ دینے کو الفاظ ڈھونڈنے لگا تھا کہ وہ کہنے لگی۔

''دُعا کرنا سرمد! اللہ میاں مجھے کسی آزمائش میں نہ ڈالے۔ میرا سائبان میری چھت ہمیشہ سلامت رہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بہت آہستگی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

اس نے اپنی زندگی میں اتنے تنہا، اُداس اور فارغ دن نہیں گزارے تھے، جتنے کہ لندن میں قیام کے دوران گزارے۔ بس پہلے دن ہی وہ جنید خان کے ساتھ ہاسپٹل گئی تھی۔ اس کے بعد اسے ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان کی تیمارداری کو وہیں ان کے پاس موجود رہے گی لیکن اس کی اجازت نہیں تھی۔ بائی پاس کے بعد وہ ایک بار انہیں دیکھنے کی غرض سے گئی تھی۔ ریسیپشن پر جا کر جب اس نے جنید خان کا نام لیا تو وہاں موجود لڑکی نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک بٹن آن کیا اور سامنے اسکرین روشن ہو گئی۔ اس نے دیکھا جنید خان سو رہے تھے اور ان سے متعلق ہدایات کا چارٹ جسے وہ لڑکی روانی سے پڑھ کر اسے سنانے لگی۔

''کیا میں ان سے مل سکتی ہوں۔'' اس کے خاموش ہوتے ہی وہ پوچھنے لگی۔

''سوری!'' لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔

ساتھ ہی اس کی سہولت کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ یہاں آنے کی بجائے فون کر کے ان کے بارے میں معلوم کر لیا کرے۔ پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ ظاہر ہے جب وہ ان سے مل نہیں

سکتی تھی اور نہ ہی قریب جا کر انہیں دیکھ سکتی تھی تو پھر ہاسپٹل جانے کا کیا فائدہ۔ دن میں دو، تین بار فون کر کے ان کے بارے میں معلوم کر لیتی۔

انسان جب تنہا ہوتا ہے تو بہت ساری سوچیں اور خیالات ایک دم اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ وہ باتیں جنہیں انسان کبھی فراغت میں بیٹھ کر سوچنا چاہتا ہے اور وہ باتیں جنہیں کبھی سوچنا نہیں چاہتا، وہ سب ایک ساتھ ذہن کے دریچوں پر دستک دینے لگتیں ہیں۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ایک تو فراغت دوسری تنہائی جس نے عہدِ رفتہ سے اس کا ناتا جوڑ دیا۔ بہت ساری یادیں، بہت ساری باتیں اور ان سب پر حاوی نانی اماں کی ایک بات۔۔۔

''خدانخواستہ! جنید کو کچھ ہو گیا تو اس گھر میں تمہاری جگہ نہیں رہے گی۔''

اس ایک بات نے اسے اتنا پریشان کیا تھا کہ پھر وہ ساری باتیں بھلا کر مسلسل جنید خان کی زندگی کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔

وہ یقیناً ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جنہیں زندگی میں خواہش کے برعکس بھی کچھ ملے تو وہ اسے نصیب کا لکھا سمجھ کر جی جان سے قبول کر لیتی ہیں۔ اس نے صرف اس وقت آنسو بہائے تھے جب آنٹی نے بتایا تھا کہ ممانی جان اسے ریجیکٹ کر چکی ہیں۔ یا پھر اس وقت جب نانی اماں اور ممانی جان کی زبانی اسے صحیح صورتِ حال کا پتہ چلا تھا۔ وہ آزردہ ضرور ہوئی تھی۔ اور کئی دن تک اپنے ساتھ ہونے والے تقدیر کے مذاق پر کڑھتی بھی رہی تھی لیکن جنید خان سے پھر بھی متنفر نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کے لیے غلط انداز سے سوچا تھا۔ انہیں تو ایجاب و قبول کے مراحل سے گزرتے ہی اس نے اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ اور خالص مشرقی لڑکیوں کے انداز میں سوچتے ہوئے شاید اس کا ایمان تھا کہ جس گھر میں اس کی ڈولی اُتری ہے، وہاں سے اب اس کا جنازہ ہی نکلے گا۔

اکثر مائیں، بیٹیوں کو اسی قسم کی نصیحتیں کیا کرتی ہیں۔ اور پھر اس نے تو نانی اماں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ یقیناً انہوں نے ہی اس کی گھٹی میں یہ بات بٹھائی تھی اور اب انہوں نے ہی اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ جنید خان کے بعد اس کا کیا ہوگا؟ وہ اندر تک دہل گئی تھی۔

''اللہ نہ کرے جو جنید خان کو کچھ ہو۔'' اس کے دل سے ہر دم ایسی ہی صدائیں نکلتی تھیں۔

جس روز جنید خان ڈسچارج ہوئے، وہ اسی وقت ان سے مل سکی اور اس تمام عرصے میں پہلی بار وہ بے اختیار ان کے سینے میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

''ارے کیا ہوا بھئی!'' وہ قدرے حیرت سے پوچھنے لگے۔

''خان صاحب! میں آپ کی طرف سے بہت پریشان تھی۔''

''کم آن سویٹی! اب تو میں ٹھیک ہوں۔''

''ہاں! اللہ کا شکر ہے۔'' وہ آنسو پونچھ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ چہرے کی رنگت قدرے زردی مائل ہو رہی تھی۔ اور کچھ کمزور بھی لگ رہے تھے۔ وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے۔''

''ارے!'' وہ ہنسے پھر بغور اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ عام سی لڑکی جس میں متاثر کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اور پھر جنید خان عمر کے اس حصے میں تھے جہاں صنفِ مخالف میں کشش محسوس ہوتی بھی ہے تو دل بے اختیار نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی طرف لپکتا ہے۔ اور وہ تو عام سی لڑکی تھی جس سے شادی بھی انہوں نے محض بنٹی کی وجہ سے کی تھی کہ وہ بہت تنہائی محسوس کرتا تھا۔ اور کوئی گورنس اس کے پاس زیادہ دن ٹک کر نہیں رہتی تھی۔ یوں وہ بیوی لا کر قدرے مطمئن ہو گئے کہ کم از کم وہ گورنس کی طرح چھوڑ کر جائے گی تو نہیں۔ اور اب وہ حیران ہونے کے ساتھ دل ہی دل میں خاصے پشیمان بھی ہو رہے تھے کہ جسے انہوں نے کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا وہ کتنے خلوص سے انہیں اپنی زندگی کی دعا دے رہی تھی۔

''آپ کیا سوچنے لگے؟'' وہ ایک ٹک انہیں اپنی طرف دیکھتے پا کر سادگی سے پوچھنے لگی تو وہ چونک گئے۔

''یہ بتاؤ، تم نے میرے لیے کتنی دعائیں مانگیں۔''

''بے شمار، نہ صرف دعائیں بلکہ منتیں بھی جو گھر جا کر پوری کروں گی۔''

''کیوں؟ میرا مطلب ہے تمہیں میری زندگی سے کیا فائدہ ہے؟'' بالآخر بزنس مین ے جو سود و زیاں کی بات ضرور کرتا ہے۔

''فائدہ!'' وہ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ''میں کسی فائدے نقصان کو نہیں تی خان صاحب! میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ میرا سائبان ہیں۔ اور ہمارا معاشرہ بے سائبان عورت کو کوئی مقام نہیں دیتا۔''

''تم اس انداز سے سوچتی ہو؟''

''ہاں! مجھے اسی انداز سے سوچنا سکھایا گیا ہے۔'' پھر براہِ راست ان کی آنکھوں میں ھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

''کیوں، کیا میرے سوچنے کا انداز غلط ہے؟''

''نہیں۔'' وہ ہلکے سے مسکرائے تھے۔

☆☆☆

انہوں نے اپنی واپسی کی اطلاع نہیں دی تھی۔ بس اچانک ہی آ گئے تھے۔ لیکن گھر میں ب کو موجود دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فرحیہ اپنے بچوں سمیت موجود تھی۔ اسی طرح طاہر خان بھی ی بچوں سمیت اسلام آباد سے آیا ہوا تھا اور آصف خان کراچی سے۔ یوں جیسے ان سب کو جنید ان کی واپسی کی اطلاع مل گئی ہو اور وہ اس کے استقبال کو موجود ہوں۔ ایک افراتفری اور خوشگوار ے ہنگامے کا سا سماں تھا۔ جنید خان جس وقت اس کا ہاتھ تھامے ہوئے بڑے ہال کمرے میں اخل ہوئے تو لمحہ بھر کو سب خاموش ہو کر اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر سب سے پہلے فرحیہ ماصے پر جوش انداز میں آگے بڑھی۔

''ویلکم ڈیڈی! کیسے ہیں آپ؟''

''فائن بیٹا! آپ کیسے ہو؟'' جنید خان نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر فرحیہ کو اپنے ساتھ لگایا۔

پھر باری باری سب آگے بڑھ آئے اور ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگے۔

''خان صاحب پلیز! آپ بیٹھ جائیں۔'' اس نے کہا تو سب کو خیال آیا۔

''ہاں ڈیڈی! آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔'' وہ بیٹھے تو پوچھنے لگے۔

''تم سب کو ہماری آمد کا کیسے معلوم ہوا جبکہ ہم نے تو اطلاع ہی نہیں دی تھی۔''

''دیکھ لیں ڈیڈی! ہمارا کمال۔'' فرحیہ اِترا کر بولی۔

''آپ نے اطلاع نہیں دی تھی لیکن ہم نے پھر بھی معلوم کر لیا۔''

''اور پتہ ہے ڈیڈی!'' طاہر خان کی بیوی سارہ کہنے لگی۔ ''ہم آپ کی صحت یابی کی خوشی میں زبردست پارٹی ارینج کریں گے۔''

پھر کتنی دیر تک وہ سب اسی قسم کی باتیں کرتے رہے اور جنید خان مسکرا مسکرا کر اپنی اولاد کا جوش و خروش دیکھ رہے تھے، جبکہ وہ ان سب کے درمیان اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہی تھی کیونکہ کسی نے ایک بار بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ بنی نے بھی نہیں اور جنید خان تو شاید بھول گئے تھے کہ وہ بھی یہاں موجود ہے۔

رات میں جس وقت وہ سب کی طرف سے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تو دیکھا جنید خان کوئی فائل دیکھنے میں مصروف تھے۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھ آئی اور ان کے ہاتھ سے فائل لے لی۔ انہوں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو کہنے لگی۔

''ابھی نہیں خان صاحب! ابھی آپ کو کوئی کام نہیں کرنا۔ آپ مکمل ریسٹ کریں گے۔''

''اوکے۔'' انہوں نے بڑی جلدی ہتھیار ڈال دیے اور فائل اس کے ہاتھ سے لے کر بریف کیس میں رکھتے ہوئے بولے۔

''بچے سو گئے کیا؟''

''نہیں، سب ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہیں۔''

''ہاں۔ یہ سب جب اکٹھے ہوتے ہیں تو یونہی رات رات بھر محفل جمائے رکھتے ہیں۔'' پھر اُٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

''آؤ ہم بھی کچھ دیر ان کی محفل میں بیٹھ آئیں۔''

''آپ کے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔'' اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''اب تو سونا ہی سونا ہے۔'' انہوں نے کہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کمرے سے نکل آئے۔ ٹی وی لاؤنج سے گزر کر گیلری میں داخل ہوئے تو ڈرائینگ روم سے آتی آوازوں پر اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پھر آگے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ٹھٹھک کر رُک گئے۔ طاہر خان کہہ رہا تھا۔

''یار! ڈیڈی نے زندہ واپس آ کر تو ہمارا سارا پروگرام خراب کر دیا۔''

''اور کیا؟'' فرحیہ کے لہجے میں بھی مایوسی تھی۔ ''میں تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ اب ان کی ڈیڈ باڈی ہی دیکھنے کو ملے گی، اس پر دو چار آنسو بہائیں گے اور پھر.....''

''میں تو اب آنسو بہا رہا ہوں۔'' یہ آصف خان تھا۔ ''پتہ ہے میں نے تو عاشی سے یہ کہا ہے کہ کراچی والا پروجیکٹ میری ذاتی ملکیت ہے۔ اب اگر اسے یہ معلوم ہو گا کہ وہ میرا نہیں، میرے ڈیڈ کا ہے تو میری کتنی سکی ہو گی۔''

''چہ۔ چہ'' فرحیہ نے افسوس کا اظہار کیا۔ پھر طاہر خان سے کہنے لگی۔ ''سنو! تم نے ڈیڈی کے بینک بیلنس کا پتہ کیا تھا؟''

''نہیں، یہ کام صبح کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن اب کیا فائدہ اب تو وہ آ ہی گئے ہیں۔''

''زندہ سلامت۔'' آصف خان کے جلے کٹے لہجے پر باقی سب ہنسنے لگے تھے۔ اور وہ جو سانس روکے کھڑی تھی۔ اپنے کندھے پر دباؤ محسوس کر کے فوراً جنید خان کی طرف دیکھنے لگی۔ جانے کیا تھا ان کے چہرے پر، ان کی آنکھوں میں کہ وہ ان کی کمر کے گرد بازو ڈال کر پلٹی اور

دوبارہ انہیں اپنے کمرے میں لے آئی۔ احتیاط سے بیڈ پر لٹایا تو وہ کہنے لگے۔

''یہ سب کچھ انہی کا تو ہے پھر.....''

''ریلیکس خان صاحب! پلیز۔ آپ کچھ نہ سوچیں۔ یہ سب نادان ہیں۔ ٹھہریں میں آپ کے لیے دودھ میں گلوکوز ملا کر لاتی ہوں۔''

وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد دودھ کا گلاس لیے واپس آئی تو جنید خان فون پر کسی سے کہہ رہے تھے۔

''ہاں بس اسے بے سائبان نہیں ہونا چاہیے، یہ گھر اور ٹیکسٹائل مل!'' ریسیور ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا۔

''خان صاحب!'' وہ فوراً آگے بڑھی۔ اور ان کے جھٹکے کھاتے وجود کو اپنے بازوؤں میں لینے کی ناکام کوشش کے ساتھ ہی اسکے حلق سے چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اور اس کی چیخوں کی آواز سُن کر ہی سب بھاگے آئے تھے۔

''آصف خان! ڈاکٹر کو بلاؤ۔'' اس نے چیخ کر کہا اور ڈاکٹر کے آنے تک یہ شدید ہارٹ اٹیک جنید خان کی جان لے گیا۔ ڈاکٹر ان کی نبض دیکھنے کے بعد ان کی موت کی تصدیق کر رہا تھا۔ اور وہ یک دم گم صُم ہوگئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھا۔ جو یقیناً اپنے آپ کو آنسو بہانے کے لیے تیار کر رہے تھے۔

☆☆☆

کئی دن لوگ تعزیت کے لیے آتے رہے۔ اس کے ابو جی اور آنٹی بھی آئے تھے۔ اور وہ اس امید پر بار بار ان کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہیں گے لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی بلکہ اس کے پاس تو بہت تھوڑی دیر بیٹھے۔ زیادہ تر جنید خان کی اولادوں کے پاس رہے تھے۔ جو لوگوں کے سامنے غم واندوہ کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ اسے اونچے طبقے کے ان خودغرض لوگوں سے کراہیت آنے لگی، جن کے نزدیک پیسہ اور جائیداد ہی سب

کچھ تھا۔

پھر جب لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ سب بہن بھائی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ شاید جائیداد کو نئے سرے سے آپس میں تقسیم کر رہے تھے۔ اس نے کچن سے آتے ہوئے ایک نظر ان سب کو دیکھا۔

اور بے شمار اندیشوں میں گھر کر اپنے کمرے میں جانے کو تھی کہ فریحہ نے اسے پکار لیا۔ وہ وہیں سے پلٹ کر بے حد خاموش نظروں سے دیکھنے لگی

''یہاں آؤ!'' فریحہ نے رعب سے یوں بلایا جیسے کسی ملازمہ کو بُلا رہی ہو۔ وہ کچھ سہمی ہوئی سی آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تو وہ کہنے لگی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''میں۔'' وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ، سادگی سے بولی۔ ''میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔''

''تمہارے باپ کا کمرہ ہے کیا؟'' فریحہ کے تیز لہجے پر آصف خان اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

''کم آن فریحہ! اس طرح بات مت کرو۔ ٹھہرو میں اسے سمجھاتا ہوں۔''

''تم رہنے دو۔ میں خود بات کروں گی۔'' فریحہ نے آصف خان کو ٹوکا۔ پھر اس سے کہنے لگی۔

''دیکھو! تمہارا رشتہ صرف ڈیڈی سے تھا۔ اب وہی نہیں رہے تو تمہارا یہاں کیا کام۔ اپنے گھر کا راستہ لو۔''

''اپنے گھر کا!!'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی، پھر ساری ہمتیں مجتمع کر کے کہنے لگی۔ ''میرا گھر یہی ہے اور مجھے یہاں سے کہیں نہیں جانا۔''

''ارے واہ! یہ میسنی تو بڑی تیز ہے۔'' فریحہ نے باقیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا

مذاق اڑایا۔

''اس سے پہلے کہ حصہ مانگنے لگے، نکال باہر کرو۔'' شائلہ نے سفاکی سے کہا تو باقی سب اس سے اتفاق کرنے لگے اور وہ ڈر کر قدم قدم پیچھے ہٹنے لگی۔ اسی وقت ملازم نے آ کر جنید خان کے وکیل کی آمد کا بتایا تو سب ایک دم خاموش ہو گئے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے جانے کیا اشارہ کیا تو وہ جو راہِ فرار ڈھونڈ رہی تھی، فوراً اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے ان سب کی باتوں نے بہت دکھ پہنچایا تھا اور وہ اپنے آپ کو ایک دم تنہا اور بے بس محسوس کر کے رو پڑی۔

''نانی اماں نے ٹھیک کہا تھا۔'' وہ روتے ہوئے سوچنے لگی۔ ''کہ جنید کے بعد مجھے اس گھر میں جگہ نہیں ملے گی۔''

''لیکن میں کہاں جاؤں؟'' وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔ ''ابو جی اور آنٹی نے تو جھوٹے منہ بھی ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ اور پتہ نہیں دوبارہ ماموں جان کے گھر جانا مناسب ہے بھی کہ نہیں۔'' وہ اپنے لیے کوئی راستہ تلاش کر رہی تھی کہ ملازم اسے بلانے آ گیا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر پوچھنے لگی۔

''بیگم صاحبہ! وکیل صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''باقی سب لوگ کہاں ہیں؟''

''وہیں وکیل صاحب کے پاس موجود ہیں۔''

''اچھا تم جاؤ، میں آتی ہوں۔'' وہ اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر ہاتھوں سے بال ٹھیک کیے اور دوپٹے کو پھیلا کر اوڑھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے دیکھا، وہ سب جو ابھی کچھ دیر پہلے رشتہ لحاظ بھلا کر انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اب وکیل صاحب کے سامنے

خاصے مہذب بنے بیٹھے تھے۔

''السلام علیکم بیگم صاحبہ!'' وہ قریب پہنچی تو وکیل صاحب اسے سلام کرتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ اس نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور پھر ان کے کہنے پر ان کے دائیں جانب خالی صوفے پر جا بیٹھی۔

''میرا نام ضیاء الحسن ہے اور میں جنید خان کا قانونی وکیل ہوں۔'' وکیل صاحب نے اس سے اپنا تعارف کرایا تو وہ ذرا سا سر اونچا کر کے ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''کیا ہوا تھا خان صاحب کو؟ ابھی تو وہ بائی پاس کروا کے آئے تھے، پھر اتنی جلدی یہ سب کیسے ہوا؟'' وکیل صاحب کے پوچھنے پر وہ باری باری ان کی طرف دیکھنے لگی۔ دل چاہا چیخ چیخ کر کہے۔

''ان سب کی وجہ سے، ہاں ان کی موت کے ذمہ دار یہ سب ہیں، لیکن وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش رہی۔''

''مجھے بے حد افسوس ہے بیگم صاحبہ! مرحوم بہت اچھے انسان تھے۔ اپنے آخری وقت میں وہ فون پر مجھ سے بات کر رہے تھے۔''

اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا تو اس نے سر جھکا لیا۔ وکیل صاحب کچھ دیر تک خاموش رہے پھر اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے کہنے لگے۔

''میں جانتا ہوں، ابھی آپ لوگوں کا زخم تازہ ہے لیکن میں بھی اپنے فرض سے مجبور ہوں۔ خان صاحب کی ہدایت تھی کہ میں جلد سے جلد آپ کی امانتیں آپ تک پہنچا دوں۔''

اس کے ساتھ ہی وکیل صاحب اونچی آواز میں جنید خان کا وصیت نامہ پڑھنے لگے۔ انہوں نے بچوں کی خواہش کے عین مطابق یعنی اُسی رات جو جس پروجیکٹ یا چیز کی خواہش کر رہا تھا، اس کے نام کی تھی۔ اور آخری الفاظ یوں تھے۔

''میں فیصل آباد والی ٹیکسٹائل مل اپنی بیوی جمیلہ نواز کے نام کر رہا ہوں اور ساتھ ہی یہ

گھر جو اس کا سائبان ہے۔ اگر کسی نے بجیلہ سے اس کا سائبان چھیننے کی کوشش کی تو پھر میرے وکیل ضیاء الحسن کو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کا اختیار ہے۔''

''نہیں۔'' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''یہ مٹی گارے کی دیواریں اور چھت مجھے سائباں نہیں دے سکتیں۔ میرا سائبان تو خود جنید تھے۔ وہی نہیں رہے تو میں یہ سب لے کر کیا کروں گی۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وکیل صاحب اُٹھ کر اس کے پاس چلے آئے۔ ملازم سے کہہ کر اس کے لیے پانی منگوایا اور پھر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما کر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اسی وقت فرحیہ نے بنٹی کو جانے کیا اشارہ کیا کہ وہ اپنی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

''مما پلیز! اس طرح نہ روئیں۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا تو وہ اور شدت سے رونے لگی۔

''پلیز مما!'' اس نے منتی انداز اختیار کیا۔ ''مجھے بے حد دُکھ ہو رہا ہے اور دیکھیں ضیاء انکل بھی آپ کے رونے سے پریشان ہو رہے ہیں۔''

اس نے بمشکل اپنی بلند ہوتی سسکیوں کو روکا اور وکیل صاحب سے معذرت کرتی ہوئی اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو اس وقت جنید خان کی اولادوں پر برتری حاصل ہونے پر اطمینان ضرور محسوس کرتی لیکن وہ تھی بجیلہ نواز، جس نے کبھی زیادہ کی آرزو نہیں کی تھی۔ ہمیشہ جو ملا اسی پر قناعت کی۔ خواہ خواہش کے مطابق یا خواہش کے برعکس۔ اور اب جو اسے مل رہا تھا اس کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ زندگی میں شاید پہلی بار وہ اوپر والے سے شکوہ کرنے لگی۔

''یا میرے اللہ میاں! کیا مانگا تھا میں نے۔ صرف جنید خان کی زندگی۔ کہ میرے سر پر سائبان سلامت رہے اور تُو نے وہی سائبان چھین لیا۔''

کتنے بہت سارے دن گزر گئے، وہ جو ہمیشہ سمجھوتا کر لیا کرتی تھی۔ اب ان حالات سے کسی طرح بھی سمجھوتا نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک دم تنہا ہونے کے احساس نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور وہ زندگی سے ہی مایوس ہو گئی تھی۔ ہر وقت کمرے میں بند، چُپ چاپ دیواروں کو تکا کرتی۔ کبھی ہنستی اور کبھی رونے لگتی۔ اگر کچھ دن اور وہ اسی طرح کمرے میں بند رہتی تو یقیناً پاگل ہو جاتی لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ جبھی ایک دن بنٹی اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مما! میں بالکل تنہا ہو گیا ہوں۔'' وہ اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر آزردہ لہجے میں بولا۔

''ہاں مما! کوئی بھی میرے پاس نہیں ہے۔''

''تمہارے بہن بھائی۔''

''وہ سب تو اسی روز چلے گئے تھے اور کوئی بھی مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔''

''تمہیں کسی کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہاں رہ کر کیا کروں۔ کوئی بات کرنے والا ہی نہیں ہے۔'' وہ بہت مایوس نظر آ رہا تھا۔

''میں جو ہوں۔'' وہ ایک دم کہہ گئی۔

''آپ تو شاید مجھے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں، جبھی تو اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا ہے۔''

''نہیں بنٹی! یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''میں نے تو صرف اس لیے اپنے آپ کو کمرے میں مقید کر لیا ہے کہ کہیں تم یہ نہ سمجھنے لگو کہ میں اس گھر پر قابض ہو گئی ہوں۔''

''یہ گھر آپ ہی کا تو ہے۔''

''صرف میرا نہیں، ہم سب کا۔''

''اچھا!'' وہ خوش ہوا۔ ''اس کا مطلب ہے آپ مجھے یہاں سے نکالیں گی نہیں۔''

''میں ایسا کیوں کروں گی بھلا؟''

''میرے بہن بھائی بھی تو آپ کے ساتھ ایسا کر رہے تھے۔''

''ان کا عمل ان کے ساتھ ہے، میرا عمل میرے ساتھ۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ کر بیڈ سے اُتر آئی اور اس کی چیئر دھکیلتی ہوئی بولی۔

''آؤ باہر چلیں۔ پتہ نہیں باہر کا موسم کیسا ہے!''

''بہت خوشگوار!'' بنٹی خوش دلی سے بولا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے پرانے معمول کی طرف لوٹ آئی۔ ایک جنید خان ہی تو نہیں تھے۔ باقی سب کچھ تو ویسا ہی تھا اور پھر جنید خان بھی کب اسے اتنا وقت دیتے تھے۔ اکثر دوروں پر رہتے اور یہاں ہوتے بھی تو اتنے مصروف کہ اس سے بس رسمی باتیں ہی کر پاتے تھے۔ شروع سے اس کا زیادہ وقت بنٹی کے ساتھ گزرتا تھا اور اب بھی وہی ساتھ تھا۔ پہلے اسے شبہ تھا، اب اور یقین کہ وہ صرف بنٹی کیلئے اس گھر میں لائی گئی تھی ورنہ اگر جنید خان کو بیوی کی ضرورت ہوتی تو وہ اس جیسی عام سی لڑکی سے شادی کیوں کرتے۔

حالات سے سمجھوتا کرنا ہمیشہ سے اس کی مجبوری رہی تھی۔ اور شاید یہ پہلا سمجھوتا تھا جسے کرنے میں اسے کچھ وقت لگا۔ پھر بھی وہ ہمیشہ کی طرح ہار ضرور گئی۔ اس نے سوچ لیا کہ اب اسے بقیہ زندگی یہیں گزارنی ہے، اسی گھر میں۔ ایک ایسے جوان بیٹے کے ساتھ جسے ہر قدم پر سہارے کی ضرورت ہے۔ اور جب وہ اپنی اس سوچ کے ساتھ سمجھوتا کر کے قدرے مطمئن ہونے لگی تھی تو ایک شام سرمد کا فون آ گیا۔

''سنو! میں یہیں سے بات کر رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے تمہارے شہر میں موجود

ہوں۔ اگر اجازت ہو تو تمہارے گھر تک چلا آؤں؟''

''آنا چاہو تو ضرور آؤ۔'' وہ اس کے پرانے لہجے میں کھو کر بولی۔

''تم سے ملاقات ہو سکے گی یا اب بھی اپنے خان صاحب کے ساتھ کہیں جا رہی ہو۔''

وہ یقیناً اس کے ساتھ ہونے والے سانحے سے لاعلم تھا، جبھی ایسی بات کر گیا۔

''میں کہیں نہیں جا رہی، تم آ جاؤ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کوئی گھنٹے بھر بعد وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیران حیران سی اس کی طرف دیکھے گئی۔ اس ایک سال میں کتنا بدل گیا تھا وہ۔ اس کا وہ چھریرا بدن قدرے فربہی مائل ہو کر اسے اپنی عمر سے چار پانچ سال آگے لے گیا تھا۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ اس کے چہرے کو باوقار بنا رہا تھا۔

''بیٹھنے کو نہیں کہو گی؟'' وہ اسے یوں دیکھتے پا کر نظریں چراتا ہوا بولا۔

''ہاں! بیٹھو۔'' وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''یہ بتاؤ۔ گھر میں سب لوگ کیسے ہیں اور تمہیں اتنے عرصے بعد میرا خیال کیسے آیا؟''

''تمہیں کسی کا خیال آتا ہے؟'' وہ اس کا محاسبہ کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں۔'' اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ رو پڑی۔ ''مجھے تو خود اپنا خیال بھی نہیں آتا۔''

''کیوں؟'' وہ اس کے رونے کی پروا نہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا تو جواب میں اس نے اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کا احوال کہہ سنایا۔

''سجو!'' وہ کس قدر حیران تھا۔ ''تم تنہا اپنی ذات پر اتنے دُکھ کیسے جھیل لیتی ہو۔ کم از کم ہمیں اطلاع تو کرتیں۔''

''میرا خیال تھا، تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا۔''

''وحی تو نازل ہوتی نہیں ہم پر۔ کوئی بتاتا تب معلوم ہوتا ناں۔ اور پھر میں تو ویسے بھی ٹریننگ کے سلسلے میں جرمنی گیا ہوا تھا۔ ابھی دو ہفتے پہلے لوٹا ہوں۔ بہر حال ابو جی اور امی کو اطلاع

کرتیں تو وہ تمہارے پاس ضرور آتے۔ بلکہ تمہیں اپنے ساتھ لے جاتے۔''

''اپنے ساتھ!''

''بالکل!'' وہ فوراً بول پڑا۔ ''جنید خان کے بعد تمہارا یہاں کون ہے؟''

''بنٹی!''

''کون بنٹی؟'' پھر جیسے اسے فوراً یاد آ گیا۔ ''اچھا وہ بنٹی، جنید کا معذور بیٹا۔ لیکن سجو! اس کے اپنے بہن بھائی موجود ہیں پھر تمہیں کیا ضرورت ہے اس کی گورنس بننے کی۔''

''گورنس نہیں سرمد! میں اس کی ماں ہوں۔''

''ماں!'' وہ تلخی سے ہنسا۔ ''ماں صرف جنم دینے والی ہی ہوتی ہے سجو! اور تمہیں تو یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہیے تھی۔ کیا وہ عورت تمہاری ماں بنی جسے تمہارے ابو نے تمہاری ماں کی جگہ دی۔''

''وہ عورت میری ماں نہیں بنی تو کیا ہوا، میں تو.....''

''نہیں سجو!'' وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔ ''مت اپنی زندگی برباد کرو۔ اُس کے لیے جو اپنے ماں باپ کا بھی نہیں تھا۔ یقین کرو تمہیں وہ ماں اُس وقت تک کہے گا جب تک یہ گھر اور ٹیکسٹائل مل تمہارے پاس ہے۔ آج اس کے نام کر دو تو تمہیں دھکے دے کر نکال دے گا۔ اور تم جیسی بے وقوف لڑکی سے کوئی بعید نہیں کہ اس کی باتوں میں آ کر اس کے نام لکھ بھی دو۔''

''نہیں سرمد! بنٹی ایسا نہیں ہے۔ وہ تو شروع دن سے میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔''

''ہوگا، پھر بھی میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔''

''نہیں سرمد! میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''یوں کہو۔ بڑے گھر میں رہنے کی عادی ہو گئی ہو، یہ آسائشیں وہاں نہیں مل سکتیں۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''اس بڑے گھر اور ان آسائشوں نے کیا

ہے مجھے۔''

''تو پھر چھوڑو یہ سب اور میرے ساتھ چلو۔'' اس کے بے بسی سے دیکھنے پر وہ کہنے

''سُنو! ہمارا گھر چھوٹا سہی لیکن دل بہت بڑے ہیں اور محبتوں سے لبریز بھی۔ اور محبتیں ت سے نہیں خریدی جا سکتیں۔'' پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

''میں کل کی سیٹیں او کے کروا رہا ہوں۔ تمہیں آنا ہو تو ان ساری آسائشوں کو ہمیشہ کے یہیں چھوڑ کر کل چار بجے ایئر پورٹ پر آ جانا ورنہ پھر ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔'' وہ لمبے لمبے بھرتا ہوا کمرے سے نکل گیا اور وہ گلاس ڈور سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

سرمد اس کے لیے سوچوں کے نئے دروازے کھول گیا تھا اور وہ الجھتی چلی جا رہی تھی۔ ں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کبھی سوچتی، اس کی بات مان کر ایک بار پھر نانی ں اور ممانی جان کی شفیق پناہوں میں جا چھپے اور کبھی بنٹی کا خیال آتا کہ اس کے جانے سے وہ کتنا ا ہو جائے گا۔ رات بھر میں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ صبح اپنے تھکے ہوئے ذہن کو فریش رنے کی غرض سے لان میں نکل آئی۔ لیکن یہاں بھی وہی سوچیں تھیں۔ جلد ہی اُکتا کر دوبارہ ر آئی۔ کچن کی طرف جانا چاہتی تھی کہ بنٹی کے کمرے میں آہٹ سُن کر رُک گئی۔

''بنٹی اتنی جلدی اُٹھ گیا۔'' سوچتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف آئی تو دروازے کے ں ہی ٹھٹھک کر رُک گئی۔ وہ شاید فون پر بات کر رہا تھا۔

''فریحہ آپی! کہاں تھیں آپ، میں کل شام سے آپ کو رنگ کر رہا ہوں۔''

''ہاں! یہاں خاصی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس میسنی کا کزن پتہ نہیں کہاں سے آ گیا ہے۔''

''میں نے خود سُنا تھا وہ الو کا پٹھا اسے میرے خلاف ورغلا رہا تھا۔''

''اب میں کیا کروں، اگر وہ اس کی باتوں میں آ گئی تو ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔''

اور وہ ہمیشہ تو ایسی باتوں پر خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ دروازے کو زور سے دھکا دے کر

اندر داخل ہوگئی اور اسے دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ فوراً ریسیور رکھ کر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''ارے مما! آپ اتنی جلدی اُٹھ گئیں۔''

''مما نہیں میسنی کہو۔'' اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اس انداز سے بات نہیں کی تھی۔ دانتوں کو ایک دوسرے پر جما کر اور آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کر۔

''کیا مطلب؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' بنٹی نے انجان اور معصوم بننے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور مزید کیا کہنے والی ہوں۔ اگر سُننے کا حوصلہ ہے تو سُنو۔ ورنہ ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے۔''

''میں بالکل نہیں سمجھا۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''کیا سمجھاؤں تمہیں۔ ارے تم تو یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ مجھے تم سے ہمدردی نہیں تھی۔ میں نے سچ مچ تم پر اپنی مامتا لُٹائی تھی۔ اور جس پر مامتا لٹائی جائے اس پر جان بھی نچھاور کر دی جاتی ہے۔ یہ گھر، جاگیر کیا چیز ہے۔''

''مما!''

''مت کہو مجھے مما! میں تمہاری ماں نہیں ہوں اور تمہارے جیسی، رشتوں کا تقدس پامال کرنے والی میری اپنی سگی اولاد بھی ہوتی تو میں اس کا بھی گلا دبا دیتی۔''

اس کی آواز بھرّا گئی تو اس کی طرف سے رُخ موڑتے ہوئے بولی۔

''تم نے مجھے بہت دُکھ پہنچایا ہے بنٹی! اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ بہت زیادہ اور جلد سے جلد حاصل کر لینے کی ہوس نے تم سب کو اندھا کر دیا ہے۔ ارے یہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ پھر..... لیکن نہیں۔ میں جنید خان نہیں ہوں جو تم لوگوں کی حقیقت جاننے کے بعد بھی اتنا کچھ تمہارے نام لکھ گئے۔ میں اس ساری دولت اور جائیداد کو اپنے ہاتھوں سے آگ لگا دوں گی لیکن تمہارے حوالے نہیں کروں گی۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتیں۔'' وہ جناب آپ سے تم پر آ گیا۔

''میں کیا کر سکتی ہوں۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور اس سے پہلے کہ میں تمہیں کسی کوڑے کرکٹ کی طرح اٹھوا کر باہر پھنکوانے کا سوچوں، اپنی فرحیہ آپی کو فون کرو کہ تمہیں لے جائیں ورنہ.....''

کیا کر لو گی تم؟'' وہ چیخا۔ ''یہ سب ہمارے باپ کی جاگیر ہے اور ہم تمہیں اس پر اتنی آسانی سے قابض نہیں ہونے دیں گے۔''

''شٹ اَپ!'' وہ اس سے اونچی آواز میں چیخی۔ ''مجھے ویسے بھی جاگیروں پر قابض ہونے کا کوئی شوق نہیں اور رہے تم! تو تم بھی اپنے دل سے یہ خیال نکال دو کہ کچھ حاصل کر سکو گے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ فون کی طرف بڑھی اور ریسیور اٹھا کر وکیل ضیاء الحسن کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف جب وکیل صاحب لائن پر آ گئے تو وہ کہنے لگی۔

''ضیاء صاحب! میں ہوں بجیلہ نواز۔''

''جی بیگم صاحبہ فرمائیے!''

''معاف کیجئے گا میں نے صبح ہی صبح آپ کو زحمت دی لیکن کیا کروں میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

''آپ فرمائیے کیا کام ہے۔'' انہوں نے کہا تو وہ بنٹی پر نظریں جماتی ہوئی بولی۔

''ضیاء صاحب! میں چاہتی ہوں کہ میرا یہ گھر جہاں میں رہائش پذیر ہوں، اسے یتیم اور بے سہارا لڑکیوں کے لیے ہاسٹل بنا دوں۔ اور میری ٹیکسٹائل مل کی جو سالانہ آمدنی ہے، اس میں سے پچاس فیصد ان لڑکیوں کی تعلیم اور دیگر ضروریات پر خرچ ہو، اور بقیہ پچاس فیصد مختلف مستحق اداروں کو دیا جائے۔''

''تو بیگم صاحبہ! آپ کہاں جائیں گی؟'' وکیل صاحب شاید مذاق سمجھے تھے۔

''میں انہی راہوں پر لوٹ رہی ہوں، جہاں قدم قدم پر محبتوں کے پھول کھلتے ہیں۔''

پھر فوراً اصل موضوع کی طرف آتی ہوئی بولی۔

''تو ضیاء صاحب! میرا یہ کام جلد سے جلد ہو جانا چاہیے۔ میں آج ہی یہ گھر چھوڑ رہی ہوں۔ جی ہاں، میں کراچی جا رہی ہوں۔ میرا فون نمبر لکھ لیجئے۔ آئندہ مجھ سے اسی نمبر پر رابطہ کیجئے گا۔'' دوسری طرف وکیل صاحب کی بات سُن کر بنٹی کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر بولی۔

''جی ہاں ضیاء صاحب! بنٹی میرے اس اقدام سے بہت خوش ہے، آپ تو جانتے ہیں وہ خاصا خدا ترس ہے۔ بیچارا چلنے سے معذور ہے، ورنہ آپ دیکھتے وہ غریبوں مسکینوں کے لیے کیا کچھ کرتا۔ اچھا خدا حافظ!''

وہ ریسیور رکھ کر پوری طرح بنٹی کی طرف متوجہ ہوئی تو اسے اس کے ارادے خطرناک نظر آئے۔ وہ ہاتھوں میں راڈ لیے غالباً اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ پہلے پیچھے ہٹی، پھر بھاگ کر دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

''میں اگر چلنے سے معذور نہ ہوتا تو تم اس وقت زندہ یہاں سے نہیں نکل سکتی تھیں۔'' وہ غصے میں پاگل ہو کر راڈ اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولا۔

''میں جانتی ہوں۔'' وہ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے اطمینان سے بولی۔ پھر باہر نکل کر دروازہ بند کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

پھر چار بجے تک کا وقت اس نے بے حد مصروف گزارا۔ اس دوران اس نے جنید خان کی باقی اولادوں کو فون کر کے اپنا پروگرام بتایا اور جواب میں ان کی گالیاں سُنیں۔ دوپہر ہونے تک فرحیہ کا ڈرائیور گاڑی لے کر آیا اور بنٹی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اور بنٹی کو جاتے دیکھ کر اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے تھے۔

''کاش! بنٹی ایسا نہ ہوتا۔'' اس نے سوچا تھا۔

اور ٹھیک چار بجے وہ ایئرپورٹ پر موجود تھی۔ اس نے دیکھا، سرمد متلاشی نظروں سے یقیناً اسے ہی کھوج رہا تھا۔ وہ ایک دم اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''میں آ گئی ہوں سرمد! ان ساری آسائشوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر۔'' وہ کتنی دیر تک بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک ساتھ کئی چراغ جل اُٹھے۔ جانے کب سے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کی۔ پھر جھک کر بریف کیس اُٹھایا اور قدم بڑھاتا ہوا قدرے شرارت سے بولا۔

''آ تو گئی ہو لیکن مجھ سے ذرا فاصلے پر چلو۔''

''کیوں؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''بھئی لوگ کیا کہیں گے، اتنا ہینڈسم بندہ اور ساتھ میں۔''

آگے گنگنایا۔

ے نالے لمی تے نالے کالی۔

''کیا؟'' اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ روٹھتے ہوئے بولی۔

''میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔''

''جا سکو گی واپس؟'' براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''شاید نہیں۔''

''یقین سے کہو!''

''کبھی نہیں، کبھی نہیں۔'' ایک بار نظریں جھکا کر بولی۔

دوسری بار اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تو وہ اندر تک سرشار ہو کر مسکرایا اور چلتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆☆☆

چاند سورج ہم سفر

''خدا کی قسم تم اسم بامسمیٰ ہو۔ آخر کیا سوچ کر تمہارے ماں باپ نے تمہارا نام سنجیدہ رکھا تھا۔ یقین کرو میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی پر اس کے نام کا اتنا گہرا اثر نہیں دیکھا جتنی تم اپنے نام کے زیرِ اثر ہو۔ کیا نام ہے..... سنجیدہ خانم!''

''ندا نے آواز موٹی کر کے اس کے نام پر زور دیا۔ تب بھی وہ اسی طرح خاموشی سے دیکھے گئی۔ اس پر ندا مزید جھنجھلائی۔

''اللہ کی بندی! کبھی کبھار ہنسنے کی زحمت کر لیا کرو۔ جبڑے نہیں ٹوٹ جائیں گے ہمارے۔''

''کوئی ہنسنے کی بات ہو تو ہنسوں۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''چلو تو میں لطیفہ سنا دیتی ہوں۔''

''نہیں! رہنے دو۔'' وہ اُکتا کر کہنے لگی کہ ندا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''جا کہاں رہی ہو.....؟ میری بات کا جواب تو دو۔''

''کون سی بات؟'' وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''کمال ہے یار! اتنی اہم بات کو تم اہمیت نہیں دے رہیں۔ بھئی میری شادی ہے.....آؤ گی ناں؟''

''میں.....!'' اپنی طرف اشارہ کیے وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''کوئی عذر نہیں سنوں گی۔ سمجھیں تم.....!''

''عذر کی بات نہیں ہے۔ ندا تم تو جانتی ہو.....''

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' ندا صاف مکر گئی۔

''کیوں.....کیا تم میرے ابا جی کو نہیں جانتیں؟ کتنے سخت ہیں۔ کہیں بھی جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ بس گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔ اس سے ہٹ کر تو کبھی ہم نے سوچا ہی نہیں۔ یقین کرو ہماری ایک خالہ اسی شہر میں رہتی ہیں لیکن ہم کبھی ان کے گھر نہیں گئے۔ خاص طور پر ہم بہنیں، اماں کبھی سال میں ایک آدھ بار چلی جاتی ہیں۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''ان کے بیٹے کی شادی تھی۔ انہوں نے اتنی خوشامد کی ابا جی کی کہ گھڑی دو گھڑی کے لیے ہی بیٹیوں کو بھیج دیں لیکن ابا جی نہیں مانے۔ اب تم خود سوچو.....اپنے رشتہ داروں کے ہاں تو جانے نہیں دیتے، تمہارے ہاں کیسے آنے دیں گے.....؟''

''آخر وہ ایسے کیوں ہیں؟'' ندا پوچھنے لگی۔

''پتہ نہیں.....! اماں بتاتی ہیں، شروع سے ہی ایسے ہیں۔ پہلے اماں کے ساتھ بھی اتنی ہی سختی تھی۔ میکے تک نہیں جانے دیتے تھے۔ اب بھی زیادہ تو نہیں جانے دیتے، بس وہی سال میں ایک آدھ بار۔ اور میں اور فہمیدہ تو کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''تمہارا دم نہیں گھٹتا ایسے ماحول میں؟''

''نہیں.....! شاید ہم عادی ہو گئے ہیں۔''

''بہر حال تم کچھ بھی کہو۔ میری شادی میں تمہیں ضرور آنا ہے۔'' ندا پھر اپنی بات پر اڑ

گئی۔

''تمہیں یہ اچانک شادی کی کیا سوجھی؟ کم از کم بی اے تو مکمل کر لو۔ یہی کوئی دو تین مہینے تو ہیں امتحانوں میں۔''

''کیا کروں؟ میں نے تو خود ممی سے یہی کہا تھا لیکن بیماری نے ممی کو وہمی بنا دیا ہے۔ ہر وقت یہی کہتی ہیں۔ اپنی زندگی میں میری اور بھائی کی شادی کر دیں۔''

''تمہارے بھائی کی بھی شادی ہے؟'' اس نے یونہی پوچھ لیا۔

''ممی تو ایسا ہی چاہتی ہیں لیکن بھائی کا مسئلہ یہ ہے کہ انہیں کوئی لڑکی پسند نہیں آ رہی۔'' پھر اپنے بارے میں بتانے لگی۔ ''چار سال پہلے میری منگنی میرے تایا زاد سے ہوئی تھی۔ اس وقت میرے ڈیڈی بھی حیات تھے۔ میرے تایا کی فیملی عرصہ دراز سے کینیڈا میں مقیم ہے۔ جب سے ممی بیمار رہنے لگی ہیں انہوں نے تایا جی کو لکھنا شروع کیا ہے کہ آ کر اپنی امانت لے جائیں۔ عمیر چونکہ پڑھ رہا تھا اس لیے وہ لوگ فوراً نہیں آ سکے ورنہ دو سال پہلے ہی میں رخصت ہو جاتی اور اب کیونکہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر چکا ہے، اس لیے تایا جی نے تاریخ لکھ بھیجی ہے۔ بہت مختصر مدت کے لیے آ رہے ہیں وہ لوگ۔ بس شادی کریں گے اور تین چار روز بعد ہی واپسی۔''

''گویا مجھے اپنی واحد دوست سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے.....؟'' وہ افسردہ سی ہو گئی۔

''جی ہاں! مجھے پتہ ہے، میرے جاتے ہی نئی دوستیاں.....''

''نہیں ندا۔'' وہ فوراً بول پڑی۔ ''میں کیونکہ دوستی کے تقاضے نہیں نبھا سکتی۔ اس لیے میں نے کبھی دوست نہیں بنائی۔''

''اصل میں میرے اندر تجسس پیدا ہو گیا تھا کہ تم اتنی الگ تھلگ سی کیوں رہتی ہو؟''

''بہر حال.....یہ تمہاری محبت ہے کہ مجھ جیسی بور لڑکی کے ساتھ تم نے چار سال انتہائی تحمل سے گزارے۔ اور پتہ ہے ندا! تم مجھے زندگی کے ہر موڑ پر بہت یاد آؤ گی۔ اور یہ جو کالج میں دو

تین مہینے رہ گئے ہیں' یہ تو بہت ہی مشکل گزریں گے۔ میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔''

''بے وقوف ہو تم!'' ندا اس کے افسردہ ہونے پر ٹوکنے لگی۔ ''اب کالج میں تو تمہارے ابا جی تمہیں دیکھنے نہیں آتے۔ کم از کم یہاں تو تمہیں اپنے ماحول سے نکل جانا چاہیے تھا۔''

''میں ایسا کر سکتی تھی۔'' وہ طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اس کے بعد یہ ہوتا کہ مجھے اپنا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا' جیسے فہمیدہ گھر میں اُکتائی اُکتائی سی رہتی ہے۔''

''اب میں تمہارے لیے دعا ہی کر سکتی ہوں کہ اللہ کرے تمہاری جلدی کہیں شادی ہو جائے تاکہ تمہیں آزادی کا سانس نصیب ہو۔''

ندا نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو وہ اس کے ہاتھ تھام کر بولی۔

''اپنی شادی ہو رہی ہے تو اب سب کے لیے یہی دعا کرو گی.....!''

''بالکل!'' پھر اپنی پہلی بات پر آ گئی۔ ''پھر آؤ گی ناں میری شادی میں؟''

''میرے بغیر تمہاری شادی نہیں ہو سکتی.....؟''

''نہیں۔'' ندا روٹھے لہجے میں بولی۔ ''اب دیکھو ناں! مجھ پر تو ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے تمہارے علاوہ اور کسی کو دوست نہیں بنایا۔ تمہیں کم از کم اتنا تو سوچنا چاہیے۔''

''میں کیا کروں؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''اگر میں ابا جی سے اجازت لینے کی ہمت کر بھی لوں تو بھی مجھے پتہ ہے وہ صاف انکار کر دیں گے۔''

''تمہارے ابا جی سے میں بات کروں گی۔''

''تم.....!''

''ہاں میں۔'' ندا کے حتمی انداز سے وہ ڈر گئی اور اسے بھی ڈرانے کی غرض سے بولی۔

''ابا جی کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے تمہیں ڈانٹ دیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں آرام سے اُن کی ڈانٹ سُن لوں گی لیکن انہیں منا کر ہی دم لوں گی۔''

''مشکل ہے۔'' وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اب چلو ایک پیریڈ تو تم نے مس کر ہی دیا۔ باقی تو اٹینڈ کر لیں۔''

''چلو!'' ندا بادل نخواستہ اُٹھی۔ پھر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔

''ایک دو روز میں' میں تمہارے گھر آؤں گی۔ اس کے بعد تو پھر شاید ہی کہیں نکلنا ہو۔''

''کالج کب تک آؤ گی؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''بس کل کا دن..... وہ بھی تمہاری خاطر۔''

''اور شادی کب ہے؟''

''کارڈ لے کر آؤں گی تو دیکھ لینا۔''

''اچھی بات ہے۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔

☆☆☆

ندا نے اُس سے کہا تھا کہ وہ ایک دو روز میں اس کے گھر آئے گی لیکن پورا ہفتہ گزر گیا تھا اور وہ نہیں آئی تھی۔ وہ یونہی ہر آہٹ پر چونکتی رہی۔ اصل میں اس کے اندر ایک انجانا سا خوف تھا' پتہ نہیں وہ ابا جی سے کیسے بات کرے گی؟ اور ابا جی کیا جواب دیں گے؟ کبھی سوچتی..... اچھا ہے نہ آئے اور کبھی اُس کے آنے کی دُعا کرتی۔ بہر حال لاشعوری طور پر وہ اس کی منتظر ضرور تھی۔ جبھی ہر آہٹ پر چونک جاتی تھی اور چونکنے کے ساتھ اس کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ اور ایسا ابا جی کی وجہ سے تھا۔

ابا جی کو اس نے شروع ہی سے ڈکٹیٹر کے روپ میں دیکھا تھا۔ مزاج کی سختی نے لہجے کو تو سخت بنایا ہی تھا' چہرہ بھی کھردرا اور ہمہ وقت پیشانی پر لکیریں رہتی تھیں۔ اُسے نہیں یاد کہ وہ اپنی اب تک کی زندگی میں کبھی خود سے اُن کے پاس گئی ہو یا کوئی بات کی ہو۔ اپنی بات اُن تک پہنچانے کے لیے اُس نے ہمیشہ اماں کا سہارا لیا۔ اور اماں خود بھی اُن سے بہت ڈرتی تھیں۔ پتہ نہیں وہ ایسے کیوں تھے؟ وہ اکثر سوچتی اور زیادہ ملال اس بات کا ہوتا کہ اُن کی سخت گیر طبیعت کی

بدولت گھر کا ماحول بہت گھٹا ہوا تھا۔ کہیں آنا جانا نہیں۔ اگر آس پاس پڑوس سے کوئی خاتون آ جاتی، تب بھی بعد میں وہ اماں پر بگڑتے ہوئے اس قسم کے جملے بولا کرتے تھے۔

''کوئی کام نہیں ہوتا ان عورتوں کو، بس دوسروں کے گھروں میں جھانکتی پھرتی ہیں۔''

شاید اسی لیے اماں نے کبھی کسی سے زیادہ راہ و رسم نہیں بڑھائی تھی اور خود اس نے بھی۔

جب وہ چھوٹی تھی تو اُسے تو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی لیکن آس پڑوس سے اس کی ہم عمر لڑکیاں اس کے گھر آ جاتیں تو وہ اُن کے ساتھ کھیلنے کی بجائے کن اکھیوں سے ابا جی کو دیکھا کرتی تھی کہ کہیں وہ سب کے سامنے اُسے ڈانٹنے نہ لگیں۔ یوں کھیل سے اُس کی عدم توجہی یا عدم دلچسپی کی بنا پر لڑکیوں نے خود ہی اس کے گھر آنا چھوڑ دیا۔ پھر جب وہ اسکول جانے لگی تو شروع شروع میں اُسے گھر سے نکلنا اور پھر اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ باتیں کرنا بہت اچھا لگا۔ لیکن جب ایک روز ایک لڑکی نے اس سے کہا۔

''پہلے تم میرے گھر آنا پھر میں تمہارے گھر آؤں گی۔''

تو اسی وقت سے وہ کچھ محتاط سی ہو گئی تھی۔ نام تو اس کا تھا ہی سنجیدہ..... اپنے اوپر بھی سنجیدگی کا ایسا خول چڑھایا کہ کلاس کی لڑکیاں بھی اس سے کترانے لگی تھیں۔

یہ صورتِ حال اُس کے لیے پریشان کُن تو تھی لیکن وہ مطمئن بھی تھی کہ اب کوئی اسے اپنے گھر تو نہیں بُلائے گا اور نہ ہی اس کے گھر آنے کی بات ہو گی۔ انہی حالات میں وہ پروان چڑھی۔ اسکول کے بعد کالج میں بھی وہ ایسی ہی تھی۔ سب سے دُور دُور، الگ تھلگ سی۔ اپنے آپ کو کتابوں میں گُم رکھتی۔ اور ندا کو پتہ نہیں اس کی کون سی ادا پسند آئی تھی کہ اس کے گریز کرنے کے باوجود زبردستی اس کے ساتھ لگی رہتی اور بالآخر اس سے دوستی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ وہ ندا پر کھلتی چلی گئی۔ اور ندا کو اس سے کچھ ایسی اُنسیت سی ہو گئی تھی کہ محض اس کی خاطر اس نے کسی اور کی دوستی قبول نہیں کی۔ یہ چار سال دونوں نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ اس دوران ندا کبھی اُس کے گھر نہیں آئی تھی اور نہ کبھی اس نے اُسے بُلایا تھا۔

شاید وہ جانتی تھی کہ ایسی کوئی بات اسے ایک اچھی دوست سے محروم کر دے گی۔ اور اب جب ندا کی شادی ہو رہی تھی اور شادی کے فوراً بعد اُسے کینیڈا چلے جانا تھا تو وہ چاہتی تھی کہ سنجیدہ اس کی شادی میں ضرور آئے۔ ویسے بھی وہ اس کی واحد دوست تھی۔ اور چاہتی تو وہ بھی تھی کہ ندا کی خوشی میں ضرور شریک ہو لیکن مجبور تھی۔ اندر کہیں ہلکی سی آس بھی موجود تھی کہ شاید ابا جی ندا کی بات مان لیں اور ندا تھی کہ دو دن کا کہہ کر اب تک نہیں آئی تھی۔

''سُنو!'' فہمیدہ بہت دیر سے اُسے گُم صُم دیکھ رہی تھی۔ اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔ ''ویسے تو تمہاری شکل ہے ہی پریشان سی..... لیکن اِدھر کچھ دنوں سے زیادہ پریشان نظر آ رہی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ گہری سانس لے کر سیدھی ہو بیٹھی۔

''سجی! تمہیں کم از کم مجھ سے تو کوئی بات نہیں چھپانی چاہیے۔'' فہمیدہ اس سے چھوٹی ہونے کے باوجود تنبیہی لہجے میں بولی۔

''میں کچھ نہیں چھپا رہی۔''

''پھر پریشان کیوں ہو؟''

''اصل میں ندا کی شادی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں ضرور اس کی شادی میں شرکت کروں۔'' اس نے بتایا۔ پھر کہنے لگی ''اب تم بتاؤ! کیا ابا جی جانے دیں گے؟''

''مشکل ہے۔'' فہمیدہ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

''اور ندا کہہ رہی تھی، وہ خود آ کر ابا جی سے اجازت لے گی۔ میں سوچتی ہوں اگر ابا جی نے اسے صاف منع کر دیا تو کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ حالانکہ میں نے اُسے ابا جی کے بارے میں بتا رکھا ہے کہ اُن کا مزاج کیسا ہے۔ پھر بھی.....''

اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی کیونکہ سامنے سے ندا آ رہی تھی۔ وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

''دیکھو! ندا آ بھی گئی۔'' فہمیدہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔ پھر کھڑی ہو گئی اور ندا کے

قریب آنے پر کہنے لگی۔

''آپ ہیں ندا.....!''

''تم یقیناً فہمی ہو۔'' ندا مسکرا کر بولی۔

''جی! آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ غائبانہ تعارف تو پرانا ہے بلکہ ابھی بھی ہم آپ ہی کی باتیں کر رہے تھے۔''

''سچی میری برائیاں کر رہی ہوگی۔'' ندا اُسے دیکھ کر شرارت سے بولی۔

''تعریفیں ہی تعریفیں.....یقین کر لیں۔''

''یقین کر لیا۔ اب جلدی سے بتاؤ تمہارے ابا جی کہاں ہیں؟'' وہ یوں اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ جیسے ابا جی یہیں کہیں بیٹھے نظر آ جائیں گے۔

''تم بیٹھو تو سہی۔'' وہ کُرسی اس کے سامنے کھینچ کر بولی۔

''نہیں یار! میں بیٹھ نہیں سکتی۔'' ندا نے بیٹھنے سے انکار بھی کیا اور بیٹھ بھی گئی۔ پھر کہنے لگی۔ ''اصل میں ممی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس لیے مجھے آنے میں دیر ہوئی۔ اب بھی بڑی مشکل سے آئی ہوں۔''

''تمہاری ممی کو ہوا کیا ہے؟''

''پتہ نہیں یار! جب سے ڈیڈی کی ڈیتھ ہوئی ہے تب سے ہی ممی بیمار رہتی ہیں۔ میرا تو خیال ہے ڈاکٹرز اُن کا مرض تشخیص ہی نہیں کر پا رہے ورنہ جتنی باقاعدگی سے اُن کا علاج ہو رہا ہے اب تک تو ٹھیک ہو چکی ہوتیں۔ بہر حال شادی کے بعد بھائی جان انہیں باہر لے جا رہے ہیں۔''

''اللہ میاں انہیں اچھا کر دے۔'' اس نے تسلی کے بول بولے۔ پھر فہمی سے کہنے لگی۔

''جاؤ! تم چائے تو بناؤ۔''

''نہیں سجو! چائے رہنے دو۔'' ندا فوراً کھڑی ہو گئی۔ ''مجھے بس جلدی سے اپنی اماں اور ابا جی سے ملوا دو۔''

''وہ دونوں اندر ہیں۔ آؤ چلو!''

''میرا خیال ہے تم یہیں ٹھہرو.....میں اُن سے بات کر آتی ہوں۔''

اس کا ذرا سا چہرہ دیکھ کر ندا نے اُسے وہیں رُکنے کا کہا اور خود اندر چلی گئی تو وہ فہمی کا ہاتھ پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ دونوں بہنوں نے جیسے سانس تک روک لیا تھا اور اُن کا دھیان اندر کی طرف تھا جہاں سے ندا کا بس پہلا جملہ ہی سُنائی دیا تھا۔

''میں ندا ہوں.....سنجیدہ کی دوست۔ اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی رہی ہوں۔'' اس کے بعد پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

''فہمی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ بہت آہستہ آواز میں بولی تو فہمی اُسے وہاں سے اُٹھا کر کچن میں لے آئی اور اسٹول پر بٹھاتے ہوئے بولی۔

''تم تو بالکل پاگل ہو سجی! ایسی ڈرنے والی کون سی بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ابا جی منع کر دیں گے۔''

''ہاں!'' ہاں کی صورت آہ نکلی اور اُس نے دیوار سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولی۔

''گزشتہ چار سالوں میں ندا اور میں کبھی ایک دوسرے سے نہیں روٹھے۔ اور یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ اب جب ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں تو ندا خفا ہوگی۔''

''وہ تم سے کیوں خفا ہوگی؟''

''تم دونوں یہاں ہو؟'' ندا کچن کے دروازے میں سے جھانک کر بولی تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ پل میں وہ مجسم سوالیہ نشان بن گئی تھی۔

''عجیب لڑکی ہو تم.....! ہمیشہ مجھے اپنے ابا جی سے ڈراتی رہیں۔'' ندا اُس کے دیکھنے پر شروع ہو گئی۔ ''جبکہ وہ تو اتنے اچھے ہیں۔ کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ بڑے آرام سے اجازت دے دی۔''

''کیا.....؟''اس کے ساتھ ساتھ فہمی کے ہونٹ بھی کھل گئے۔

''اور کیا.....اور اب تم ضرور آنا بلکہ سب آنا۔''

''اچھا تم بیٹھو تو سہی۔پہلی بار آئی ہو اور کچھ نہیں تو ایک کپ چائے ہی پی لو۔''

''اگر ممی کی طرف سے پریشانی نہ ہوتی تو میں ضرور رُکتی۔بہر حال بشرطِ زندگی چائے پھر کبھی سہی۔''ندا معذرت کرتے ہوئے بولی۔اور ایک بار پھر اُن دونوں کو آنے کی تاکید کرتے ہوئے چلی گئی تو دونوں ابا جی کے اجازت دینے کو معجزے سے محمول کرتے ہوئے تبصرہ کرنے لگیں۔

''کب سے دوستی ہے اس لڑکی سے.....؟''رات میں جب ابا جی عشاء کی نماز کے لیے چلے گئے تو اماں اُس سے پوچھنے لگیں۔

''چار سال سے۔''

''پہلے تو وہ کبھی یہاں نہیں آئی۔''اماں نے کہا تو وہ شاکی نظروں سے دیکھنے لگی جبکہ فہمیدہ بول پڑی۔

''اور کون آتا ہے ہمارے ہاں جو آپ کو ندا کا پہلے نہ آنا کھل رہا ہے۔ابا جی کا رویہ ہی ایسا ہے کہ ہم نے کبھی اپنی کسی سہیلی کو گھر نہیں بلایا۔''

''میں تم سے تو بات نہیں کر رہی۔''اماں کو فہمی کا بولنا ناگوار گزرا تو ٹوک دیا۔

''آپ بات ہی ایسی کر رہی ہیں۔''

''اچھا! تم چپ رہو۔''

''لیجیے! چپ ہو گئی۔''فہمی نے کہا ضرور لیکن منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہی تھی۔

☆☆☆

ندا نے سب کو بلایا تھا اور اس کے سامنے تو ابا جی نے بھی ہامی بھری تھی لیکن جب اس کی شادی میں جانے کا وقت آیا تو ابا جی جانے پر آمادہ ہی نہیں ہوئے اور نہ ہی اماں اور فہمی کو جانے

کی اجازت دی۔

''بجی کی سہیلی کی شادی ہے۔بس وہی چلی جائے اور کسی کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''اُن کی بات دوٹوک ہوا کرتی تھی۔

اُس کے لیے یہی غنیمت تھا کہ ابا جی نے اُسے منع نہیں کیا تھا لیکن اکیلے جاتے ہوئے وہ بہت گھبرا رہی تھی۔کچھ عجیب سا بھی لگ رہا تھا کیونکہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کہیں جا رہی تھی۔گو کہ بہت سادگی سے تیار ہوئی تھی.....پھر بھی عام دنوں کی نسبت بہت اچھی لگ رہی تھی۔ہلکے بادامی رنگ کا سادہ سُوٹ اس کی رنگت سے میچ کر رہا تھا۔سیدھی مانگ کے ساتھ بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چوٹی' آنکھوں میں فہمی نے زبردستی کا جل لگا دیا تھا جو پھیل کر کناروں تک چلا آیا تھا' جس سے سیاہ آنکھوں کی خوبصورتی نمایاں ہو گئی تھی۔ندا نے گاڑی بھیج دی تھی جس سے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔

جس وقت وہ ندا کے گھر پہنچی' اس وقت تک بہت کم مہمان آئے تھے۔پھر ندا نے اُسے بتایا کہ بس اتنے ہی لوگوں کو بلایا گیا ہے۔کیونکہ اس کی ممی کی طبیعت کافی خراب تھی۔اِدھر اُس کے تایا جی بھی خاص طور سے بیٹے کی شادی کے لیے آ چکے تھے۔پھر خود ممی بھی یہی چاہتی تھیں کہ جلد سے جلد اُس کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں اور وہ کسی طرح بھی شادی ٹالنے کے حق میں نہیں تھیں بلکہ اُن کی یہ خواہش تھی کہ ندا کے ساتھ ساتھ بیٹے کے سر پر بھی اسی وقت سہرا سجا دیں۔اور اُن کے بیٹے کو کوئی اعتراض تو نہیں تھا لیکن مسئلہ وہی لڑکی کا تھا۔اب تک ممی نے اُسے جتنی لڑکیاں دکھائی تھیں.....وہ سب کو مسترد کر چکا تھا۔پتہ نہیں وہ کیا چاہتا تھا یا اُس کی پسند کیا تھی؟ ممی بہر حال خاصی مایوس ہو گئی تھیں اور شاید یہ بھی سمجھنے لگی تھیں کہ وہ شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔

ندا کا نکاح ہوا.....وہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔بہت خاموشی سے تمام کارروائی دیکھتی رہی۔اس کے کچھ ہی دیر بعد ندا کی ایک کزن بوکھلائی ہوئی آئی۔

''ندا پلیز! جلدی آؤ۔آنٹی کی طبیعت بہت بگڑ رہی ہے۔''

ندا اُسی حالت میں اُٹھ کر بھاگی تو وہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی لیکن جس کمرے میں وہ داخل ہوئی' وہ اس کے دروازے پر ہی رُک گئی تھی۔ محض یہ سوچ کر کہ پتہ نہیں اندر کون کون ہوگا۔ پھر اُسے یوں دروازے پر کھڑے رہنا بھی اچھا نہیں لگا تو دوبارہ پہلے والے کمرے میں آ گئی۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ بیڈ کے کنارے خاصے تکلف سے بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں ندا کی ممی کے ٹھیک ہونے کی دعا مانگنے لگی۔ گو کہ یہ شادی کا گھر تھا لیکن اچانک اس قدر سناٹا چھا گیا تھا کہ اُسے شُبہ ہونے لگا کہ جیسے وہ کسی غلط جگہ آ گئی ہو۔

''میرے خدا.....! کوئی خوشی دے تو اس طرح نہیں کہ آس پاس غم کے بادل منڈلاتے ہوں۔'' اُس نے سوچا اور اُٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ندا آ گئی۔

''کیسی ہیں آنٹی؟'' وہ فوراً پوچھنے لگی۔

''ڈاکٹر چیک کر رہا ہے۔'' ندا کی آواز بھرّائی ہوئی تھی اور وہ جلدی جلدی اپنے زیور اُتار کر دراز میں رکھنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو الماری سے کپڑے نکال کر باتھ روم میں گھس گئی۔ وہاں سے واپس آئی تو اُس سے کہنے لگی۔

''تم بھی کیا سوچتی ہوگی کہ یہ کیسی شادی ہے.....''

''ارے نہیں!'' وہ بڑھ کر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ''بس آنٹی اچھی ہو جائیں۔''

''ندا.....!'' ندا کی کزن اُسے پکارتی ہوئی آ گئی۔

''اب بتاؤ کیا کریں۔ وہ نواب صاحب کہہ رہے ہیں جو بھی ہو' جیسی بھی ہو مجھے منظور ہے۔ بس ممی کی یہ خواہش فوراً پوری ہونی چاہیے۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' ندا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے باری باری دونوں کو دیکھنے لگی۔

''اس طرح مت بیٹھو ندا! پلیز کچھ کرو۔ اس وقت آنٹی کی ایک ہی خواہش ہے۔'' اس

ل کزن منت سے بولی۔

''میں کیا کروں؟'' ندا کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ اخلاقاً پوچھنے لگی۔

''ممی بھائی جان کی شادی دیکھنا چاہتی ہیں.....اس وقت۔'' ندا اچانک خاموش ہو ئی۔ نظریں اس پر جمائے پتہ نہیں کیا سوچنے لگی تھی۔

''تم کچھ کہہ رہی تھیں۔'' اس نے کہا تو ندا نے چونک کر سر جھٹکا۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کر لی۔

''سُو بجی! تم میرے بھائی جان سے شادی کر لو۔''

''کیا.....؟'' اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔

''پلیز بجی! یہ میری ممی کی آخری خواہش ہے۔ پتہ نہیں اس کے بعد ممی.....''

ندا ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی تو وہ پریشان ضرور ہوئی لیکن اُسے چُپ کرانے کی وشش نہیں کی۔ اس کی کزن کہنے لگی۔

''دیکھیں..... عام حالات میں تو یہ یقیناً بہت احمقانہ سی بات ہوتی لیکن اس وقت سئلہ یہ ہے کہ ہم فوری طور پر کوئی لڑکی نہیں ڈھونڈ سکتے اور آنٹی کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس وقت ن کی خواہش رد کی جا سکے۔''

''تو آپ بھی تو ہیں.....آپ کیوں نہیں.....؟'' وہ اسی قدر کہہ سکی۔

''میں شادی شدہ ہوں۔'' اس کے انکشاف پر اس نے بغور اُسے دیکھا۔ پھر نفی میں سر تے ہوئے بولی۔

''آئی ایم سوری! میں اتنا بڑا قدم نہیں اُٹھا سکتی۔ میرے والدین تو مجھے زندہ دفن کر یں گے۔''

''بجی! میرے ساتھ اندر آؤ۔'' ندا ایک جھٹکے سے اُٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتے

ہوئے اپنی ممی کے کمرے میں لے آئی۔ اور اُن کے نحیف ونزار وجود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''دیکھو! یہ ہیں میری ممی۔ بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو میں اپنی زندگی کو کھینچ رہی ہیں۔ اگر تم میں حوصلہ ہے تو جاؤ اُن سے کہہ دو کہ اُن کی زندگی میں اُن کی یہ آرزو پوری ہونا ممکن نہیں ہے۔''

''پلیز ندا!'' وہ رو پڑی۔ ''کسی اور سے کہو۔''

''کوئی اور یہاں ہو تب ناں!''

''میں کیسے مان لوں.....؟ میرے حالات تم جانتی ہو۔ میں تو تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ پہلے جا کر میرے ابا جی سے بات کرو۔ کیا کہیں گے وہ کہ تمہاری شادی میں آئی اور اپنی شادی کی بات کرنے لگی۔ نہیں ندا! زندگی میں پہلی بار ہی میں اُن کے اعتماد کی دھجیاں اُڑا دوں.....؟ نہیں۔'' وہ تاسف سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''ایک صورت ہے۔'' ندا کی کزن پتہ نہیں کب اُن کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ پُر سوچ انداز میں بولی تو وہ دونوں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''شادی برائے شادی۔''

''کیا مطلب؟'' ندا فوراً پوچھنے لگی تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تم کسی کو بتانا مت کہ یہاں تمہاری شادی ہوئی ہے۔ ابھی تم آنٹی کی خاطر ہامی بھر لو۔ پھر جس طرح خاموشی سے تمہارا نکاح ہوگا بعد میں جب حالات بہتر ہو جائیں گے تو اسی خاموشی سے تمہیں طلاق نامہ بھی مل جائے گا۔ یقین کرو یہ بات ہم تینوں کے درمیان رہے گی۔''

''نکاح کی کیا ضرورت ہے۔ تم لوگ ایسے ہی مجھے آنٹی سے متعارف کرا دو۔ کچھ بھی کہہ کر میرا مطلب ہے جس بات سے وہ مطمئن ہوں۔''

''ایسا کر دیکھتے ہیں۔'' ندا اس کی بات سے قائل ہو کر بولی۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ

ے قریب لا کھڑا کیا اور اپنی ممی پر جھک کر بولی۔

''ممی! دیکھئے کون آیا ہے.....؟'' ممی نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ اسے آگے رتے ہوئے بولی۔

''آپ بہو دیکھنا چاہتی ہیں ناں! تو یہ دیکھئے بھائی جان کی پسند.....''

''ماشاء اللہ!'' ممی کمزور آواز میں بولیں اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے تو وہ بالکل ارادی طور پر اُن کے پاس بیٹھ گئی اور اُن کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''آپ بہت جلد اچھی ہو جائیں گی۔''

''تم میرے پاس رہو گی تو ضرور اچھی ہو جاؤں گی۔'' ممی نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ندا کو قریب بلا کر کہنے لگیں۔

''اپنے تایا جی کو بلاؤ۔ وہ ابھی تمہارے بھائی کے سر پر سہرا باندھیں گے۔''

''جی!'' ندا نے گھبرا کر اُسے دیکھا اور وہ ممی کے ہاتھ چھوڑ کر فوراً کھڑی ہو گئی جبکہ ممی ابات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

''میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس سے پہلے کہ سانسوں کا رشتہ ٹوٹ جائے اپنے ابا جی سے کہو جلدی کریں۔ میں اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ لوں۔''

''ایسی باتیں نہ کریں ممی! آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ پھر ہم دھوم دھام سے بھائی جان کی شادی کریں گے۔'' ندا نے کہا تو ممی کی آنکھوں میں پانی جمع ہو کر کناروں سے بہنے

''پلیز ممی! آپ مت روئیں۔''

''تم میری بات مانو اور اپنے تایا جی اور تائی جی کو بلاؤ۔'' ممی نے اصرار سے کہا تو وہ جا انہیں لے آئی اور انہیں دیکھتے ہی ممی کہنے لگیں۔

''بھائی جی! میرے بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیں۔''

اُس نے بے حد خوفزدہ ہو کر ندا کو دیکھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہیں صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ پھر اُسے کچھ خبر نہیں ہوئی کہ کمرے کے اندر اچانک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ تائی جی نے بڑا سا سُرخ دوپٹہ اس کے اوپر یوں ڈال دیا کہ وہ اس میں چھپ گئی تھی۔ وقتی طور پر اسے یوں لگا جیسے وہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہو اور اب کسی کو نظر نہیں آئے گی۔ لیکن پھر اچانک اُسے کسی انہونی کا احساس ہوا۔ فوراً وہاں سے اُٹھ کر جانا چاہتی تھی کہ ندا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور سرگوشی میں بولی۔

''پلیز بجی' میری خاطر.....!'' اس نے وحشت زدہ ہو کر اُسے دیکھا' دوسری طرف کوئی کہہ رہا تھا۔

''تمہیں قبول ہے؟''

''ہو سکتا ہے تمہاری ایک ذرا سی ہاں میں میری ممی کے لیے نئی زندگی کی نوید ہو.....!''

ندا کا منت بھرا انداز اور اس کی آنکھوں میں التجائیں مچل رہی تھیں۔

وہ بے بس ہو گئی۔ ہونٹوں سے سسکی کی صورت ہاں نکلی۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ندا نے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ وہ خود بھی رو رہی تھی۔ اُسی وقت تایا جی اس کے بھائی کے سر پر سہرا سجا کر اُسے ممی کے پاس لے آئے۔ جسے دیکھتے ہی ممی تکیے کے سہارے ذرا سی اونچی ہو گئیں۔ اچانک اُن کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ بیٹے کی پیشانی چوم کر اُسے ڈھیروں دعائیں دیں۔ پھر ندا کو اشارہ کیا تو وہ اسے اُٹھا کر ممی کے پاس لے آئی۔ وہ اب سسکیوں سے رو رہی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے بہہ کر اس کا پورا چہرہ بھگو رہے تھے۔

''روتے نہیں بیٹا!'' ممی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی کو ہونٹوں سے چھوا تو وہ بھیگی پلکیں اُٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔ وہ مانند چراغ سحری نظر آئیں۔ تب اس کے آنسو جو پل بھر کو رُکے تھے' پھر بہہ نکلے۔ ممی پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھیں' وہ کچھ نہیں سُن پائی۔ بس روئے چلی جا رہی تھی اور اُسے یہ خبر نہیں ہوئی کہ ممی کے دوسرے طرف کھڑا ایک شخص چُپ چاپ

ے دیکھے جا رہا تھا۔ بس کسی کسی وقت اس کے ہونٹ ذرا سے متحرک ہوتے' یوں جیسے اندر مچلتی کسی ہش کو سرزنش کر رہا ہو۔

''ندا! دُلہن کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔'' تائی جی بھی اسی طرح رو رہی تھیں۔ ندا ے بٹھا کر جلدی سے پانی لے آئی اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے بمشکل ایک دو ونٹ حلق سے اُتارے۔ پھر اس کا ہاتھ پرے ہٹاتے ہوئے بولی۔

''کاش! ہمیشہ کی طرح اب بھی ابا جی مجھے تمہارے ہاں آنے کی اجازت نہ دیتے۔''

''بجی پلیز!'' ندا اس کے سامنے نیچے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ ''اس طرح پریشان مت سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تمہیں اندازہ نہیں ہے ندا۔ اگر میرے گھر میں کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو.....''

''فکر مت کرو! ہم وہ وقت آنے ہی نہیں دیں گے۔'' ندا اُسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''بس دُعا کرو ممی اچھی ہو جائیں۔ پھر ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔ چلو اُٹھو اب تم منہ دھو لو اور اب رونا نہیں۔'' وہ اُسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے اُٹھ کر باتھ روم میں چلی ا۔ واپس آئی تو ندا کہنے لگی۔

''چلو! اب کھانا کھا لو۔''

''میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ اور ویسے بھی اب دیر ہو گئی ہے۔ مجھے چلنا چاہیے پلیز۔ ڈرائیور سے کہو مجھے چھوڑ آئے۔'' ندا کچھ دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔ پھر قریب آ کر اس کے تھام کر بولی۔

''تم خفا تو نہیں ہو؟''

نفی میں سر ہلاتے ہوئے پھر اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

''پلیز! اب مت رونا۔'' ندا منت سے بولی۔

''مجھے تمہارے رونے سے بہت دُکھ ہو رہا ہے اور میں گلٹی فیل کر رہی ہوں۔ یقین کرو

جو کچھ اچانک ہوا اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ بہر حال..... تم بالکل فکر مت کرو بلکہ یوں سمجھو کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور سنو! اس واقعے کو سوچ سوچ کر پریشان مت ہوتی رہنا۔ میں کل ہی بھائی جان سے کہہ کر.....''

تائی جی کے آنے سے ندا کی بات ادھوری رہ گئی۔ اور وہ ان کی طرف متوجہ ہوگئی جبکہ وہ اپنی چادر اوڑھ کر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

''تم جا رہی ہو؟'' تائی جی ندا سے بات کرتے کرتے اس سے پوچھنے لگیں۔

''جی!''

''چلو! میں ڈرائیور سے کہتی ہوں تمہیں چھوڑ آئے۔'' اس سے پہلے کہ تائی جی اس سے مزید سوال جواب کرتیں' ندا اسے لے کر باہر آ گئی۔

''سنو ندا! میں زیادہ دن تک یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکوں گی۔'' وہ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے بولی۔

''میں نے کہا ناں! بالکل فکر مت کرو۔'' ندا نے اُسے یقین دلایا کہ وہ کل ہی اُسے بہت خاموشی اور رازداری سے اس مجبوری کے بندھن سے نجات دلا دے گی۔

گھر میں داخل ہوئی تو اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی سے سامنا نہ ہو۔ اس لیے پہلے تو کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے باتھ روم میں گھس گئی۔ اس بہانے کتنی دیر تک اپنی آنکھوں اور چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی رہی۔ مسلسل روتے رہنے کی وجہ سے آنکھیں سُرخ ہونے کے ساتھ سوجی ہوئی بھی لگ رہی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی اماں اور فہمی سوال پر سوال کرنے لگیں گی۔ اور اُسے یہی ڈر تھا کہ کہیں کسی مقام پر اس کے منہ سے اپنے بارے میں کوئی بات نہ نکل جائے۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ندا کے گھر میں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس کی خبر اگر اس گھر میں کسی کو ہوگئی تو ابا جی سچ مچ کا گلا دبا دیں گے۔

پھر جب وہ باتھ روم سے نکلی' تب بھی اس کا خیال تھا چپ چاپ بستر میں گھس جائے گی ن فہمی جیسے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

''کیسی رہی شادی.....؟''

''کس کی؟'' کیونکہ ذہن مسلسل اُلجھا ہوا تھا' اس لیے بلا ارادہ منہ سے نکل گیا۔

''کس کی سے کیا مطلب؟ جس کی شادی میں گئی تھیں اس کا احوال پوچھ رہی ں۔'' فہمی نے کہا تو وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ٹوکتے ہوئے بولی۔

''زیادہ دھوم دھام نہیں تھی کیونکہ ندا کی ممی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اس لیے بس گنتی ے چند لوگ ہی تھے اور بہت سادگی سے نکاح ہوا۔''

''کیا ندا کی رخصتی بھی ہوگئی ہے؟'' فہمی پوچھنے لگی۔

''نہیں..... میرا خیال ہے تین چار روز بعد وہ رخصت ہو کر سیدھی کینیڈا ہی جائے ا۔''

''پھر تم اتنا کیوں روئی ہو؟''

''کیا؟'' وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

''بھئی' جب وہ رخصت ہی نہیں ہوئی تو پھر تم کیوں روئیں؟''

''وہ اپنے گھر سے رخصت نہیں ہوئی لیکن مجھ سے تو ہوگئی ناں! اب کہاں ہماری فات ہوگی.....!'' وہ سوچ کر بولی۔

''یہ تو ہے۔'' فہمی سر ہلانے لگی۔ پھر کچھ دیر بعد بولی۔ ''ویسے تمہاری دوست بہت ی تھی۔ اگر اسی شہر میں رہتی تو شاید پھر کبھی ملاقات ہو جاتی لیکن اب تو وہ کینیڈا جا رہی ہے۔''

''ہاں!'' وہ جو احتیاط سے اپنے کپڑے تہہ کر رہی تھی انہیں رکھنے الماری کی طرف بڑھ ا۔ وہاں سے پلٹی تو پوچھنے لگی۔

''اماں کہاں ہیں؟''

''ابا کے لیے جوشاندہ بنا رہی ہیں۔''

''کیا ہوا ہے ابا جی کو؟''

''بس ذرا گلے میں خراش ہے اور کچھ نہیں۔'' فہمی اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم تو کھانا کھا کر آئی ہو گی؟''

''ہاں!'' اس نے جھوٹ بولا۔ ویسے بھی اس وقت کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بس یونہی فہمی کے پیچھے کچن تک آئی۔ کھڑے کھڑے اماں سے دو چار باتیں کیں۔ پھر نیند کا بہانا کر کے اپنے بستر پر آ گئی۔

وہ رات اس پر بہت بھاری تھی۔ ایک پل کے لیے وہ سو نہیں سکی۔ زندگی میں کبھی اتنا بڑا حادثہ رونما ہو جائے گا۔ یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ حقیقتاً وہ اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اس قدر اچانک اور اتنی جلدی جلدی میں سب کچھ ہوا کہ وہ پریشان تو تھی ہی۔ اب اُسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہ کس طرح اجنبی لوگوں کے درمیان اتنی مجبور ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ندا کی ممی کا نحیف و نزار وجود آ سمایا' جن کی آنکھوں کی بجھتی ہوئی شمعیں اُس وقت روشن ہونے لگی تھیں۔ جس وقت انہوں نے اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیکھا تھا۔

''ہو سکتا ہے تمہاری ایک ذرا سی ہاں میں میری ممی کے لیے نئی زندگی کی نوید ہو.....!''

ندا کا منت بھرا لہجہ یاد آیا تو اس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔ اور وہ بڑے خلوص سے اس کی ممی کی صحت و زندگی کے لیے دعا کرنے لگی۔

☆☆☆

پوری رات اس نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ کبھی بے شمار اندیشوں میں گھرتی اور کبھی اپنے آپ کو حوصلہ دیتی رہی تھی۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی اُس نے بستر چھوڑ دیا۔ پہلے وضو کر کے نماز پڑھی۔ پھر کچن میں آ گئی۔ رات بھر جاگنے اور پریشان سوچوں کی وجہ سے سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور اب دل چاہ رہا تھا چپ چاپ جا کر سو جائے۔ لیکن اس صبح کے انتظار میں ہی تو وہ جاگتی رہی

تھی کیونکہ ندا نے کہا تھا کہ وہ کالج میں اس کے پاس آئے گی اور ظاہر ہے' وہ اس وقت تک چین سے نہیں رہ سکتی تھی جب تک اس مجبوری کے بندھن سے نجات حاصل نہ کر لے۔

اس نے چائے بنا کر وہیں بیٹھے بیٹھے ایک کے بعد دوسرا کپ پیا۔ جس سے اس کے اعصاب پر قدرے اچھا اثر پڑا۔ پھر ناشتہ بنا رہی تھی کہ باقی سب بھی اُٹھ گئے۔ اس نے پہلے اماں اور ابا جی کے لیے ناشتہ بنا کر فہمی کے ہاتھ اندر بھیجا۔ پھر خود فہمی کے ساتھ وہیں کچن میں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی۔

''آج کالج سے چھٹی کر لو۔'' فہمی اُسے مغرور دیکھتے ہوئے بولی تو وہ چونک پڑی۔

''کیوں؟''

''مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔''

''نہیں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ فوراً بولی۔

''کوئی نہیں..... آنکھیں بھی اتنی سُرخ ہو رہی ہیں۔''

''جاگنے کی وجہ سے.....'' وہ بے خیالی میں کہہ گئی۔ پھر فوراً احساس ہوا تو سنبھلتے ہوئے بولی۔

''اصل میں کل ندا نے بہت رُلایا۔ خود بھی روتی رہی تھی۔ ویسے تو میرا بھی آج کالج جانے کو دل نہیں چاہ رہا لیکن آج ایک اہم لیکچر ہے۔ اگر مس ہو گیا تو مشکل ہو جائے گی۔ پھر ندا کے علاوہ میری اور کوئی دوست بھی نہیں ہے جو یہ سوچ کر بیٹھ رہوں کہ اُس سے لے لوں گی۔''

دل میں چور ہو تو انسان یونہی دوسرے کو مطمئن کرنے کے لیے پوری تفصیل بیان کر ڈالتا ہے۔ اس نے عجلت سے پوری چائے حلق سے اُتاری اور فہمی کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کچن سے نکل آئی۔

پھر وہ نہ صرف اس دن بلکہ ہر دن کالج کے اُسی گوشے میں جہاں وہ فری پیریڈ میں ندا کے ساتھ بیٹھتی تھی وہیں بیٹھ کر ندا کا انتظار کرتی رہی۔ اور ندا پتہ نہیں بھول گئی تھی یا کیا تھا کہ اتنے

وعدے کرنے کے باوجود نہیں آئی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر ندا اُس کے ساتھ یہ کیسا مذاق کر گئی ہے کہ اُس کی جان پر بن گئی ہے۔ کاش اُس کے اختیار میں ہوتا تو وہ خود جا کر اُس سے پوچھتی

اور ستم تو یہ تھا کہ اگر اپنے اندر ہمت پیدا کر بھی لیتی تو ندا کے گھر کا ہی معلوم نہیں تھا۔ اُس کی شادی میں گئی ضرور تھی لیکن کیونکہ اُس کا ڈرائیور لینے آیا تھا اور وہ بھی پہلی بار کسی کے گھر جا رہی تھی۔ اس لیے راستوں سے بالکل نا آشنا تھی اور اُس نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ اس کے بعد وہ پھر کبھی اس طرف نہیں آئے گی۔

بہر حال ندا کی لاپرواہی نے اُسے دُکھ دینے کے ساتھ عجیب مشکل میں ڈال دیا تھا کہ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے لیے کتنی مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں۔ اور انہی مشکلات کو سوچ سوچ کر وہ نہ صرف پریشان بلکہ خوفزدہ بھی تھی۔ پھر اماں اور ابا کی عزت کا خیال بھی تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

انہی دنوں امتحان سر پر آ گئے اور کالج سے بھی ناتا ٹوٹ گیا۔ یہ چند دن جو امتحانوں کی تیاری کے تھے، وہ سب پریشانی میں گزر گئے۔ کتاب کھول کر ضرور بیٹھتی لیکن ذہن مسلسل ''اب کیا ہوگا.....؟'' میں اُلجھا رہتا تھا۔

اُس روز وہ پہلا پیپر دے کر آ رہی تھی کہ دروازے پر پوسٹ مین نے اُسے ایک لفافہ دیا۔ اس نے دیکھا، لفافے پر اُسی کا نام تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ فوراً لفافہ بیگ میں ڈالا اور اس اتفاق سے دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے اندر آئی۔ اماں برآمدے ہی میں بیٹھی تھیں۔ وہ محض یہ جاننے کے لیے کہ کہیں انہوں نے پوسٹ مین کی آواز تو نہیں سُن لی، اُن کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

''بجلی کا بل وغیرہ تو نہیں آیا؟''

''نہیں..... کیوں؟'' اماں تعجب سے اُسے دیکھنے لگیں۔

''ابھی پوسٹ مین یہاں سے گزر رہا تھا۔ میں سمجھی شاید بل وغیرہ ڈال گیا ہوگا۔'' پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''کھانا تیار ہے؟''

''ہاں! بس روٹی ڈالنی باقی ہے۔ کب سے فہمی سے کہہ رہی ہوں روٹی ڈال دے لیکن وہ رسالے میں ایسی مگن ہے..... جب تک ختم نہیں کرے گی، اُٹھے گی نہیں۔''

''میں کپڑے بدل لوں، پھر ڈال دیتی ہوں۔''

''تم کیوں ڈالو گی۔ پہلے ہی تھکی ہوئی آئی ہو۔ اور ہاں پرچہ کیسا ہوا؟''

''اچھا ہو گیا ہے۔'' اس کا سارا دھیان بیگ میں موجود لفافے کی طرف تھا۔ سرسری انداز میں جواب دے کر اندر چلی گئی۔ فہمی کو روٹی ڈالنے کے لیے کہا اور کپڑے لے کر بیگ سمیت باتھ روم میں گھس گئی۔ بڑی عجلت میں لفافہ نکال کر کھولا اور سب سے پہلے بھیجنے والے کا نام دیکھا۔ ندا کا خط تھا اور اُس نے لکھا تھا۔

''سجی! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تمہاری کیفیت کا میں بخوبی اندازہ کر سکتی ہوں اور یقین کرو..... اس تمام عرصے میں، میں مسلسل تمہارے بارے میں سوچتی رہی ہوں اور میں تم سے کم پریشان نہیں ہوں۔ اصل میں حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ میں وعدے کے باوجود تم سے فوری رابطہ نہ کر سکی۔ تم نے اُن حالات میں جس طرح ہماری مدد کر کے میری ممی کو چند لمحوں کی جو خوشی بخشی تھی وہ تمہارا مجھ پر ایک احسان ہے جو میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتی۔

میں تمہیں بتاؤں سجی.....! کہ میری ممی شاید وہی خوشی دیکھنے کے لیے زندہ تھیں۔ اُسی رات وہ ہم دونوں بہن بھائی کی طرف سے مطمئن ہو کر دُنیا سے ناتا توڑ گئیں۔ میری اُس وقت کی کیفیت کو تم سمجھ سکتی ہو۔ کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ اور اسی حالت میں ممی کے سوئم کے بعد ہی نایاجی وغیرہ مجھے اپنے ساتھ کینیڈا لے آئے تھے۔

یہاں آ کر بھی میں بہت دنوں تک سنبھل نہیں پائی تھی۔ پھر تم تو جانتی ہو، وقت بڑا مرہم

ہے۔رفتہ رفتہ سب کچھ بھلا دیتا ہے۔میں اگر بھولی نہیں تو کافی حد تک سنبھل ضرور گئی اور یقین کرو سب سے پہلے مجھے تمہارا خیال آیا۔

تمہاری پریشانی کا سوچ کر میں جس طرح کڑھتی ہوں.....اس کا شاید تم اندازہ نہ کرسکو۔تم اب تک یقیناً مجھ سے خاصی متنفر ہو چکی ہوگی اور سوچتی ہوگی کہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکہ کیا ہے۔ایسی بات نہیں ہے بجی! اب جب میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی ہوں تو دیکھو سب سے پہلے تمہیں ہی لکھ رہی ہوں۔

میں نے بھائی جان کو بھی پوری تفصیل لکھ دی ہے۔تم بس اتنا کرنا کہ کسی دن بھائی جان کو فون کر دینا۔اس کے بعد وہ خود ہی سب ٹھیک کرلیں گے۔

اور کیا میں اُمید رکھوں کہ تمہاری ناراضگی ختم ہو چکی ہوگی۔پلیز بجی! میں نے انجانے میں تمہیں جو اذیت دی ہے اس کے لیے مجھے معاف کردو۔''

تمہاری ندا

''ندا!''اس کی پلکوں سے آنسو موتیوں کی صورت ٹوٹ ٹوٹ کر خط پر گرنے لگے۔

''میں واقعی تم سے بہت متنفر ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہاری ممی.....''

''سنجیدہ!''اماں آواز دے رہی تھیں۔

اُس نے جلدی سے خط تہہ کر کے دوبارہ بیگ میں رکھا۔پھر کپڑے بدلے اور منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی۔اماں تخت پر دسترخوان بچھا رہی تھیں۔اس نے کچن میں آ کر ڈونگے میں سالن نکالا اور پلیٹیں لے کر تخت پر آ بیٹھی۔فہمی روٹی لے کر آ گئی تو تینوں کھانے میں مصروف ہوگئیں۔

''بجی! تمہارا پیپر کیسا ہوا ہے؟''فہمی کو بڑی دیر بعد خیال آیا۔

''ہیں!''وہ اپنی سوچوں میں مگن تھی۔بس اُس کی آواز سُن سکی۔اس لیے کچھ چونک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔اور فہمی اپنا سوال دُہرانے کے بجائے کہنے لگی۔

''ایمان سے تمہیں دیکھ کر میرا بھی دل چاہنے لگا ہے کہ پھر سے پڑھنا شروع کر

دوں۔''

''بالکل پڑھو، کس نے منع کیا ہے؟تمہاری غلطی ہے کہ میٹرک کے بعد ہی گھر بیٹھ رہیں۔''

''کیا کروں.....؟پڑھنے میں دل نہیں لگتا۔''فہمی صاف گوئی سے بولی۔

''رسالے تو بڑے شوق سے پڑھتی ہو۔''

''وہ تو رسالے ہوتے ہیں.....مزے مزے کی کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔''

''کسی دن ابا جی نے دیکھ لیا ناں تو ساری مزے مزے کی کہانیاں بھلا دیں گے۔''

''ابا جی کی کیا بات کرتی ہو.....! اُن کا بس چلے تو ہماری سانسوں پر بھی پابندی لگا دیں۔''

''کیا اُلٹی سیدھی ہانک رہی ہو.....؟''اماں نے ٹوکا۔

''غلط نہیں کہہ رہی۔ہر وقت ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔کون آیا.....کون گیا؟ بجی وہاں کیوں کھڑی ہے تو فہمی یہاں کیوں بیٹھی ہے؟

اور جس دن سے بجی ندا کی شادی سے ہو کر آئی ہے، انہیں مسلسل یہ فکر ہے کہ کچھ بدلی بدلی سی لگتی ہے۔''

''کیا؟''اس کا چونکنا لازمی تھا۔پوری آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگی اور وہ اسی روانی سے بولی۔

''اور کیا تمہیں نہیں پتہ۔ہر وقت تو اماں سے کہتے رہتے ہیں کہ بجی سے پوچھو وہاں شادی میں ایسی کیا بات ہوگئی ہے کہ وہ چپ چپ سی رہنے لگی ہے۔''

''اماں!''وہ روہانسی ہو کر بولی۔''ابا جی ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟''

''اس کا تو دماغ خراب ہے۔''اماں فہمی پر بگڑتے ہوئے کہنے لگیں۔

''انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔اور اگر وہ تم دونوں کی فکر کرتے ہیں تو اس میں کیا

بُرا ہے۔ زمانے کے چال چلن دیکھ رہے ہیں۔ ایسے میں کیا اُن کا فرض نہیں بنتا کہ تم دونوں کا خیال رکھیں۔''

'اس کو خیال رکھنا کہتے ہیں.....؟'' فہمی دل کی بھڑاس نکالنے کے موڈ میں تھی لیکن اماں نے اس بُری طرح ڈانٹا کہ بے چاری منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی اور وہ بہت خاموشی سے وہاں سے اُٹھ آئی۔

وہ ابا جی سے بہت ڈرتی تھی۔ اب جو فہمی نے ایسی بات کہی تو اندر ہی اندر اس کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔ اگر ابا جی کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو وہ پتہ نہیں کیا کر ڈالیں گے.....!

یہی سوچ کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی۔ ندا کے خط سے بھی کچھ ڈھارس بندھی تھی اور اگلے ہی روز جب وہ پیپر دے کر نکلی تو قریبی پی سی او سے ندا کے گھر فون کر ڈالا۔ دوسرے طرف ریسیور غالباً کسی ملازم نے اُٹھایا تھا۔ اس کی آواز سُن کر پوچھ رہا تھا۔

''آپ کون ہیں بی بی؟''

''میں ندا کی دوست ہوں۔'' وہ بمشکل اپنی آواز کو نارمل رکھ پائی جبکہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

''ندا بی بی تو یہاں نہیں ہیں۔ وہ تو.....''

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ اس کی پوری بات سنے بغیر بولی۔

''پھر آپ کس سے بات کریں گی۔''

''میں!'' وہ ندا کے بھائی جان کا نام سوچنے لگی لیکن اس کی یادداشت میں کہیں کوئی نام نہیں تھا۔ تب زچ ہو کر بولی۔

''ندا کے بھائی جان کو بلاؤ۔''

''وہ تو جی اس وقت آفس میں ہوتے ہیں۔''

''کس وقت آتے ہیں؟'' اس نے عجلت میں پوچھا۔

''شام کو۔'' دوسرے طرف سے اطمینان سے جواب ملا۔

''سُنو! اُن سے کہنا کہ ندا کی سہیلی کا فون آیا تھا اور میں دو دن بعد اسی وقت فون کروں گی۔ وہ گھر پر رہیں۔ سمجھ گئے ناں؟''

''جی۔''

اس نے ریسیور رکھ کر گہری سانس لی۔ پھر پیسے ادا کر کے باہر نکلی تو اپنی پسینے سے تر ہتھیلیوں کو چادر کے پلو سے رگڑتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔

اگر اُسے کالج کے علاوہ کسی دوست وغیرہ کے گھر جانے کی اجازت ہوتی تو وہ اسی بہانے شام میں نکل کر فون کر سکتی تھی لیکن یہی تو مشکل تھی اور اس کا اگلا پیپر دو دن بعد تھا۔ اس لیے اس نے دو دن بعد فون کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

''پتہ نہیں ابھی کتنے مراحل طے کرنا باقی ہیں؟''

اگلے دو دن اس نے اسی سوچ میں گزارے۔ اور مسلسل دعا کرتی رہی تھی کہ بغیر کسی پریشانی اور تردد کے سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے لیکن شاید اس کے نصیب میں آسانیاں تھیں ہی نہیں کہ اگلی بار جب اس نے فون کیا تو دوسری طرف ندا کے بھائی جیسے منتظر تھے۔ اس کی آواز سنتے ہی کہنے لگے۔

''آپ سنجیدہ ہیں ناں! سنجیدہ خانم۔''

''جی!'' ایک اجنبی کے منہ سے اپنا نام بڑا عجیب سا لگا اور خاصا ناگوار بھی۔

''کہیے کیسے مزاج ہیں؟'' یوں بے تکلفی سے پوچھا گیا جیسے مدتوں سے شناسائی ہو۔

''میرے خدا!'' وہ بُری طرح سٹپٹائی اور فوری طور پر کچھ کہہ بھی نہیں سکی۔ گو کہ اپنے طور پر وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی سے بات کرنے کے لیے اچھی طرح تیار کر چکی تھی۔

''ہیلو سنجیدہ!'' پہلے اُسے متوجہ کیا' پھر کہا۔

''بھئی میں تو صبح سے آپ کے فون کا انتظار کر رہا تھا اور آپ ہیں کہ بات ہی نہیں کر

رہیں۔''

''مجھے ندا نے خط میں لکھا ہے کہ میں آپ کو فون کرلوں۔'' وہ بمشکل بول پائی۔

''اچھا!''

وہ اچھا کہہ کر خاموش ہوگیا اور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اُسے کہنا پڑا۔

''ندا نے آپ کو بھی تو خط لکھا ہے ناں؟''

''ہاں! مجھے اس کا خط ملا ہے۔''

''پھر آپ کیا کر رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کچھ کریں ناں!'' وہ جلدی سے بولی۔

''کیا کروں؟''

وہ شاید اُسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا یا پھر اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا جبکہ وہ اندر ہی اندر سلگنے لگی۔

''دیکھیں! ایک تو آپ خواہ مخواہ انجان بن رہے ہیں۔ دوسرے بات کو بھی بڑھا رہے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے میں کس قدر مشکل میں ہوں۔''

''آپ تو خفا ہونے لگیں۔'' وہ اس کے لہجے کی تیزی محسوس کر کے کہنے لگا۔

''میں انجان نہیں ہوں۔ ندا نے مجھے ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا تھا کہ وہ بول پڑی۔

''اس مسئلے کا ایک یہی حل تو نہیں ہے کہ جس خاموشی سے ہم ایک بندھن میں بندھے تھے..... اُسی خاموشی سے اسے ختم بھی کر دیں۔ اگر آپ سوچیں تو اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس کے آس پاس جیسے سناٹوں کا راج ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس نے سانس بھی روک لی۔

''میرا مطلب ہے اس بندھن کو خاموشی سے توڑنے کی بجائے علی الاعلان مضبوط بھی تو کیا جاسکتا ہے۔''

''پلیز ایسی باتیں مت کریں۔'' وہ رو دینے کو ہوگئی۔

''میں کچھ غلط نہیں کہہ رہا سنجیدہ! آپ خود سوچیں..... یہ راستہ زیادہ آسان ہے۔''

''نہیں۔''

''کیا نہیں..... کیا آپ کسی اور کو پسند کرتی ہیں؟''

''نہیں!''

''پھر آپ کو اعتراض کیوں ہے؟ آخر کہیں نہ کہیں تو آپ کی شادی ہونی ہے۔''

''یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میرا خیال ہے یہ میرا ہی مسئلہ ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا تو لمحہ بھر کو وہ ششدر رہ گئی۔ پھر ہوش آیا تو ٹیبل پر ہاتھ مار کر کتنی بار ہیلو ہیلو کہا لیکن دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔

تب اپنی بے بسی پر آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں ریسیور اور بوجھل قدموں سے باہر نکل آئی۔

اس صورتِ حال نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا اب وہ کیا کرے۔ جتنا سوچتی، اتنا اُلجھتی جارہی تھی۔ ایک بار تو اس نے اس نہج پر بھی سوچنا کہ اس بندھن کو توڑنے کی بجائے مضبوط کر لینا چاہیے اور یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا کہ ندا بھائی پروپوزل بھیجتے جو ہوسکتا ہے، منظور کر لیا جاتا لیکن پھر اُسے فہمی کی بات یاد آئی۔

کچھ دن پہلے ہی تو وہ کہہ رہی تھی کہ ابا جی کا کہنا ہے کہ وہ جب سے ندا کی شادی سے آئی ہے بدلی بدلی سی لگتی ہے۔ اور اس بات نے اُسے مزید اس نہج پر سوچنے نہیں دیا۔ بلکہ اب تو یہ خوف دامن گیر ہوگیا کہ اگر ندا کے بھائی نے خود سے ایسی کوئی کوشش کی تو ابا جی اُسے تو صاف منع کر دیں گے ہی..... بعد میں اُسے بھی نہیں چھوڑیں گے۔ ایک طرح سے اُن کے شُبے کو یقین جو مل جائے گا۔ حالانکہ اس سارے قصے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو ندا کی ممی کی ابتر حالت دیکھ کر

بھی ہامی نہیں بھر رہی تھی۔ پتہ نہیں کیسے مجبور کر دی گئی۔ اور ندا خود تو پیا دیس سدھار گئی۔ ساری پریشانیاں اس کے لیے چھوڑ گئی تھی۔

اُسے پھر ندا پر غصہ آنے لگا۔ اور اُسی وقت اس نے اُسے خط لکھ کر اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے ساتھ لکھا کہ وہ اپنے بھائی کو منع کرے کہ اس کے ساتھ ایسا کوئی مذاق نہ کرے۔ وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

صبح جب اماں سبزی وغیرہ لانے کے لیے جانے لگیں تو اس نے وہ خط انہیں پوسٹ کرنے کے لیے دے دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس خط کا جواب آنے میں پندرہ بیس روز ضرور لگ جائیں گے اور اس دوران وہ بس ایک دو بار ہی اس کے بھائی کو فون کر سکتی تھی۔ پھر ظاہر ہے اس کے پیپر ختم ہو جاتے اور وہ گھر کی ہو کر رہ جاتی۔ پھر آخری بار جب وہ اُسے فون کر رہی تھی تو خاصی دلبرداشتہ تھی۔

''آخر آپ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں؟''

''میں تنگ نہیں کر رہا سنجیدہ خانم! آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' وہ خاصی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔

''شادی کوئی گڈے گڈی کا کھیل نہیں ہے۔ ایک بار ہو گئی سو ہو گئی۔''

''میں اس شادی کو نہیں مانتی۔'' وہ بے حد تلخی سے بولی۔

''آپ کے نہ ماننے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔''

''آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''بس یہ بتا دیں' بارات لے کر کب آؤں؟''

''شٹ اَپ......!'' وہ آپے سے باہر ہو گئی

لیکن پھر فوراً احساس ہوا کہ اس طرح معاملہ بجائے سلجھنے کے مزید بگڑ جائے گا۔ تب سنبھلتے ہوئے بولی۔

''دیکھیں! یہ قطعی ناممکن ہے۔''

''میرے نزدیک یہ ناممکن نہیں ہے۔ کہیے تو ابھی ممکن بنا دوں؟''

''نہیں!''

''آخر آپ ایسا کیوں نہیں چاہتیں؟'' اس نے اصرار سے پوچھا اور وہ اسے اپنے یلو حالات کیسے بتا دیتی۔ بس ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

''میرا خیال ہے' آپ خوفزدہ ہیں۔'' وہ خود ہی کہنے لگا۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ بھیگے لہجے میں بولی۔

''آپ بس وہی کریں جو ندا نے مجھ سے کہا تھا۔''

''ندا بے وقوف ہے۔''

''سب سے بڑی بے وقوف اور احمق تو میں ہوں۔'' بالآخر اس کا ضبط جواب دے گیا ہ پھٹ پڑی۔

''ایک لب گور عورت پر رحم کھاتے ہوئے' اس کی آخری آرزو پوری کرنے کی خاطر جیسے شخص کے لیے ہامی بھر لی۔ جسے ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ میں کس مشکل میں گرفتار ۔ ہو سکتا ہے آپ کے لیے یہ کوئی بات نہ ہو لیکن میں جس طبقے اور ماحول کی پروردہ ہوں۔ یہ مجبوری نہیں...... سراسر لغزش قرار دی جائے گی اور اس لغزش کی سزا آپ جانتے ہیں؟'' اس واز بھرا گئی تھی۔ اس لیے خاموش ہو گئی۔

''سنجیدہ!'' اس نے اندیشوں میں گھر کر پکارا۔

''مت نام لیں میرا۔''

''میں ہرگز آپ کو اپنا نام لینے کی اجازت نہیں دوں گی۔''

''چلیے۔ میں آپ کا نام نہیں لیتا لیکن آپ سہولت سے میری بات سُن لیں۔'' وہ الجانہ انداز میں بولا۔

''میں صرف یہ سُننا چاہتی ہوں کہ آپ کب مجھے اس مجبوری اور اب زبردستی کے بندھن سے نجات دلا رہے ہیں؟''

''کبھی نہیں۔'' اس نے اطمینان سے اس کے سر پر بم دے مارا کہ اُسے سنبھلنے میں کتنی دیر لگی۔

پھر جب بولنے کے قابل ہوئی تو انتہائی نفرت سے بولی۔

''احسان فراموش ہیں آپ۔ اور سُن لیں کہ میں مر جاؤں گی لیکن آپ کا ساتھ قبول نہیں کروں گی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

☆☆☆

اُس کی آخری اُمید اب ندا تھی کہ شاید وہی کچھ کرے گی لیکن ابھی تک اس نے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ اُسے خط لکھے ہوئے بھی ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ بہر حال وہ بڑی شدت سے منتظر تھی۔

پھر ندا کا خط تو نہیں آیا البتہ اس کے لیے ایک دو جگہ سے پیغام آ گئے جس سے وہ بُری طرح بوکھلا گئی۔ اور اس وقت تو وہ پاگلوں کی طرح فہمی کو دیکھنے لگی تھی جب اس نے بتایا کہ ابا جی بڑی سنجیدگی سے ابتسام احمد کے رشتے پر نہ صرف غور کر رہے ہیں بلکہ چھان بین بھی کر رہے ہیں

''یہ کیسے ممکن ہے بھلا؟'' اس کا ذہن جو کچھ سوچ رہا تھا اسی حساب سے اس کے منہ سے نکلا۔

''کیوں ممکن نہیں ہے؟'' فہمی اُلٹا اسی سے پوچھنے لگی تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

''میرا مطلب ہے ابھی تو میں امتحانوں سے فارغ ہوئی ہوں اور ابھی سے اماں اور ابا جی کو میری شادی کی فکر ہو گئی۔''

''فکر تو انہیں بہت دنوں سے تھی۔'' فہمی اپنی معلومات کا رعب جماتے ہوئے بولی۔

''بس تمہارے شوق کی وجہ سے ابا جی خاموش تھے کہ تم بی اے کر لو..... پھر سوچیں گے۔ اب اسے اتفاق کہہ لو یا تمہاری قسمت کی خوبی کہ جیسے ہی تم نے بی اے کیا..... اچھا رشتہ آ گیا۔''

''لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''کیوں؟'' فہمی کے انداز میں شوخی تھی۔ ہونٹوں پر دبی دبی شریر مسکراہٹ۔

''پہلے میں ایم بی اے کروں گی۔'' وہ یہی عذر سوچ سکی۔

''ابا جی سے پوچھا ہے؟ چچا ماموں کے گھر تو جانے نہیں دیتے کہ اُن کے جوان جہان لڑکے ہیں۔ یونیورسٹی جانے دیں گے؟ کبھی خواب میں بھی مت سوچنا۔''

''میں یونیورسٹی جانے کو کب کہہ رہی ہوں؟ پرائیویٹ کر لوں گی۔''

''شادی کے بعد کر لینا۔'' فہمی نے لاپرواہی سے مشورہ دیا تو وہ اس کے ہاتھ تھام کر منت سے بولی۔

''سُنو! تم کسی طرح اماں کو راضی کر لو۔ پھر وہ خود ہی ابا جی سے بات کر لیں گی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو؟'' فہمی اب کچھ ٹھٹک کر اُسے دیکھنے لگی۔

''اماں تو تمہارے بی اے کرنے کے بھی خلاف تھیں۔ وہ بھلا مانیں گی۔''

''چلو! میں ایم بی اے نہیں کرتی لیکن شادی.....'' وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

''سب ہی کی شادی ہوتی ہے۔ تمہاری کوئی دنیا میں نرالی تو نہیں ہو گی۔ ویسے بھی میں نے ابتسام احمد کو دیکھا ہے۔ بہت اچھے ہیں اور میں تو اسی دن سے دُعا کر رہی ہوں کہ اللہ کرے یہیں تمہاری بات پکی ہو جائے۔''

''کیا؟'' وہ اندر ہی اندر سہم کر بولی۔ ''تم نے کہاں دیکھا ہے انہیں؟''

''اس روز آئے تو تھے۔'' فہمی نے پہلے سرسری انداز میں بتایا۔ پھر اچنبھے سے کہنے لگی۔

''سجی! رہتی تو تم بھی اسی گھر میں ہو۔ پھر تمہیں ان باتوں کی خبر کیوں نہیں ہوتی۔ تمہیں

اس گھر سے دلچسپی نہیں ہے یا.....''

یا کے ساتھ ایسی نظریں کہ وہ کٹ کر رہ گئی۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ٹوکا۔ پھر زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولی۔

''خبر تو مجھے سب رہتی ہے فہمی! بس انجان بن کر تم سے پوچھنے میں مزہ آتا ہے۔'' پھر اس کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔

''تم جب اپنی معلومات کا رعب جھاڑتے ہوئے اِتراتی ہو تو بہت اچھی لگتی ہو۔''

''تم مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔'' فہمی منہ پھلا کر بولی۔

''ارے نہیں!''

''پھر سچ سچ بتاؤ۔ تم نے بھی ابتسام احمد کو دیکھا ہے۔''

''نہیں۔''

''کیوں نہیں دیکھا۔ جب وہ جا رہے تھے' اس وقت تم کچن میں تھیں۔ آرام سے دیکھ سکتی تھیں۔''

''ہاں! دیکھ تو سکتی تھی لیکن میں نے سوچا۔ پتہ نہیں ابا جی کیا فیصلہ کریں۔ ایسا نہ ہو میں اس شخص کے سپنے دیکھنے لگوں اور ادھر ابا جی انکار کر دیں۔'' وہ سوچ کر بولی۔

''میرا خیال ہے ابا جی انکار نہیں کریں گے۔ اگر ایسا کرنا ہوتا تو انہیں گھر پر کبھی نہ بلاتے۔'' وہ قصداً خاموش رہی۔

اُن دنوں وہ ذہنی طور پر تقریباً مفلوج ہو چکی تھی اور المیہ یہ تھا کہ کسی سے اپنا احوال کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کوئی ہمدم' کوئی غمگسار نہیں تھا۔

کئی بار خیال آیا کہ فہمی کو بتائے کہ وہ کس مصیبت میں گرفتار ہے لیکن فہمی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی سوائے پریشان ہونے کے۔ اس لیے ہر بار بس سوچ کر رہ گئی۔

ادھر ندا شاید اپنے بھائی کے ساتھ شریک ہو گئی تھی یا پتہ نہیں کیا وجہ تھی بلکہ اُسے نئی

صورتِ حال سے بھی آگاہ کیا تھا کہ گھر میں اس کی شادی کے تذکرے ہونے لگے ہیں۔ پھر بھی ں کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ اور اب ندا کی طرف سے تو وہ بالکل مایوس ہی ہو گئی تھی۔ ب تو اُسے یہ فکر تھی کہ ایک نکاح کے ہوتے ہوئے دوسرا نکاح کیسے ہو گا؟ وہ کس کی بیوی کہلائے ا.....؟ انہی پریشان سوچوں نے اُسے بیمار کر ڈالا۔ وہ بستر سے لگ گئی۔

اسی دوران ابا جی نے ابتسام احمد کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ وہ غالباً ان کے بارے میں مل اطمینان حاصل کر چکے تھے۔ اور وہ جو ہر طرف سے مایوس ہو کر اب شدت سے یہ دعا کرنے تھی کہ کسی طرح ابا جی انکار کر دیں تو یہاں بھی اُسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

فہمی نے اپنے تئیں اُسے خوشخبری سُنائی تھی لیکن وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ اماں ں گھبرا کر بھاگی چلی آئیں۔ غنیمت تھا کہ اس وقت ابا جی گھر پر نہیں تھے ورنہ وہ ضرور اس سے وا لیتے۔ اماں فہمی کو ڈانٹنے لگیں۔

''کیا کہہ دیا ہے تم نے اسے جو یوں رو رہی ہے؟''

''میں نے کچھ بھی نہیں کہا اماں!'' فہمی اپنی جگہ مجرم بنی کھڑی تھی۔

''کیا ہوا بیٹا.....؟ اس طرح کیوں رو رہی ہو؟'' اماں اس کا سر اپنی گود میں رکھتے ئے چمکار کر پوچھنے لگیں تو وہ اور شدت سے رونے لگی۔

''اس طرح مت روؤ۔ پہلے ہی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اماں نے دوپٹے کے سے اس کی آنکھیں اور چہرہ صاف کیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا سر تھپکنے لگیں۔

''پانی پیو گی؟'' فہمی اس کے سامنے نیچے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور اس کے چہرے سے بال تے ہوئے پوچھنے لگی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی طرح سسک سسک کر روتی رہی۔

''ضرور تم نے کچھ کہا ہے۔'' اماں پھر فہمی پر بگڑیں۔

''قسم لے لیں اماں! میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے تو بس.....'' فہمی کچھ کہتے کہتے

ایک دم خاموش ہوگئی اور بغور اُسے دیکھنے لگی۔ پھر گہری سانس لے کر اُٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

وہ لاپرواہ ضرور تھی لیکن نادان نہیں۔ ابتسام احمد کے نام پر پھوٹ پھوٹ کر رونا اُسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ پھر وہ بڑی سنجیدگی سے اس کے گزشتہ دنوں کو سوچنے لگی۔ تب اُسے ابا جی کی بات سے اتفاق کرنا پڑا کہ وہ جب سے ندا کی شادی سے ہو کر آئی ہے..... بدلی بدلی سی ہے۔ اور اس کے بدلتے انداز سے وہ اپنے تئیں یہی نتیجہ اخذ کر سکی کہ جیسا کہ عام طور پر شادیوں میں خوبصورت اتفاقات ہو جاتے ہیں۔ تو بجی کے ساتھ بھی ایسا ہی کوئی خوبصورت حادثہ ہوا ہوگا۔

فہمی اس سے ہٹ کر نہیں سوچ سکتی تھی کیونکہ وہ رسالے پڑھنے کی شوقین..... زیادہ تر افسانوی دنیا میں رہتی تھی۔ اب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی بلکہ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی کہ ندا کی شادی میں بجی کی بالکل افسانوی انداز میں کسی سے مڈبھیڑ ہوئی ہوگی اور پھر نہ صرف وہ پہلی ملاقات بلکہ مقابل شخص بھی اس کے دل میں یوں گھر کر گیا ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ جب ہی تو ابتسام احمد کے پروپوزل کا سُن کر وہ بوکھلا گئی تھی۔ اُس نے سوچا۔

''کم از کم بجی کو بتانا تو چاہیے تھا۔'' پھر خود ہی اپنی سوچ کی نفی کر دی۔

''کیا فائدہ کچھ بتانے کا۔ اُلٹا اُسے ہی برا بھلا سُننے کو ملتا۔ بے چاری چُپ چاپ اپنی آگ میں جلتی رہتی۔ اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ پھر بھی مجھے تو بتا ہی دیتی۔ کم از کم دل کا بوجھ ہی ہلکا ہو جاتا۔ میں کون سا کسی سے کہہ دیتی۔ اُسے شاید یہی خوف رہا کہ کہیں اماں اور ابا جی کو خبر نہ ہو جائے۔ بہرحال میں اسے سمجھاؤں گی کہ ابتسام بھائی بھی بُرے نہیں ہیں بلکہ بہت اچھے ہیں۔ اُن کی قربت میں وہ یقیناً گزشتہ ساری باتیں بھول جائے گی۔'' پھر اُسی روز وہ موقع دیکھ کر بڑی رازداری سے بجی کے پاس آ بیٹھی۔

''سچ سچ بتاؤ بجی! کیا تم ابتسام بھائی سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟''

اس نے کچھ حیران ہو کر دیکھا تو بولی۔

''اور کون ہے وہ جس کی وجہ سے تم اتنے اچھے پروپوزل کو ٹھکرانا چاہتی ہو؟''

''تم مجھ پر شبہ کر رہی ہو۔'' وہ تاسف سے بولی۔

''شبے کی بات نہیں ہے بجی۔ بس مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم نے اپنی آنکھوں میں کسی اور کے خواب سجا رکھے تھے۔ جن کی تعبیر نہ ملنے پر تم اس طرح ٹوٹ گئی ہو۔''

''نہیں فہمی!'' اُس نے بے حد آزردہ ہو کر ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکا لی۔

''تم خود سوچو! کیا ہمارا ماحول ہمیں خواب سجانے کی اجازت دیتا ہے۔ نہیں ناں! تو پھر تمہیں ایسا خیال کیونکر آیا؟''

''تمہاری حالت کے پیشِ نظر.....'' فہمی صاف گوئی سے بولی۔

''جب سے ابتسام بھائی کا پروپوزل آیا ہے تم پریشان ہو۔ اس سے میں نے یہی سوچا کہ شاید تم کسی اور کو.....''

''نہیں..... ایسی کوئی بات ہوتی تو تمہیں ضرور بتاتی۔''

وہ نظریں چُرا کر بولی اور اُٹھنا چاہتی تھی کہ فہمی نے اُس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ پھر اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے بولی۔

''میری طرف دیکھو کر بات کرو بجی! میں مانتی ہوں کہ جو کچھ تم نے کہا' وہی سچ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی کوئی بات ضرور ہے جو تم بتانا نہیں چاہتیں۔''

''تم خواہ مخواہ.....''

''خواہ مخواہ نہیں۔'' فہمی زور دے کر بولی۔

''میں تم سے چھوٹی ضرور ہوں لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اب تک کی زندگی ہم دونوں نے اس طرح گزاری ہے کہ کبھی کوئی تیسرا ہمارے درمیان نہیں آیا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' اس کی آواز کمزور اور دھیمی ہوگئی۔

''تم اچھی طرح جان رہی ہو کہ میں کہنا نہیں بلکہ سُننا چاہ رہی ہوں..... وہ بات جو

تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنی ہوئی ہے۔'' پھر سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''تم شاید یہ سوچ کر خاموش ہو کہ میں کیا کرسکوں گی بھلا......؟ اور یہ صحیح ہے کہ میں کچھ نہیں کرسکوں گی لیکن اس طرح کم از کم تمہارے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔ پلیز بجی! کہہ دو ورنہ میں بڑی سنجیدگی سے تم سے روٹھ جاؤں گی۔''

فہمی پہلے منت سے بولی۔ آخر میں دھمکی دی تو وہ جو پریشان سی ہوگئی تھی' رونے لگی۔ فہمی نے سوچا اُسے جی بھر کے رو لینے دے۔ اس لیے ذرا پرے ہٹ کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ لیکن وہ فوراً ہی دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔ ساتھ ہی سرگوشی میں پوچھا۔

''اماں کہاں ہیں؟''

''سو رہی ہیں۔'' فہمی سمجھ گئی وہ بتانے پر آمادہ ہے۔ اس لیے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''میں واقعی بہت پریشان ہوں فہمی بہت مشکل میں پھنس گئی ہوں۔''

''کہتی جاؤ! میں سُن رہی ہوں۔'' فہمی اطمینان سے بولی

لیکن جیسے جیسے وہ ندا کے گھر ہونے والا واقعہ بتاتی گئی' فہمی کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔

اور ساری بات بتا کر آخر میں وہ کہنے لگی۔

''میں چاہوں بھی تو اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر نہیں چھوڑ سکتی۔ گو کہ اکثر یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ ہوسکتا ہے' اس دوران کوئی معجزہ رونما ہو جائے جو مجھے دو کشتیوں میں سوار ہونے سے بچالے اور کبھی اس نکاح کو جھٹلانے کی کوشش کرتی ہوں کہ مجبوری میں ہاں کہہ دینے سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے دونوں فریقین کی دل سے رضامندی ضروری ہے جبکہ دونوں ہی راضی نہیں تھے۔ محض ممی کی خوشی کی خاطر ہاں کہہ دی۔ یہ ساری باتیں سوچ کر وقتی طور پر بہل ضرور جاتی ہوں لیکن اندر کہیں جو ایک پھانس سی چبھی ہے وہ زیادہ دیر تک خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنے دیتی۔ ایک کسک ہے جو بے یقین رکھتی ہے۔ اب تم ہی

ناؤ! میں کیا کروں......؟ میرے اختیار میں جتنا تھا اتنی کوشش تو کر چکی ہوں۔''

آخر میں وہ بے بسی سے کہتے ہوئے پھر رو پڑی تو فہمی جو اس کی بات سُن کر حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی' اس کے رونے پر چونک پڑی۔

''رو و مت......!''

''پھر اور کیا کروں؟''

''یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا۔ پھر بھی یہ طے ہے کہ رونے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ تم جاؤ......منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ میں جب تک چائے بناتی ہوں۔ پھر ذرا آرام سے بیٹھ کر حل سوچیں گے۔''

فہمی نے اُٹھتے ہوئے اُسے بھی ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔ پھر کچن میں چلی گئی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر اندر جانے کی بجائے وہیں کچن میں فہمی کے پاس آگئی تو فہمی نے ایک مگ اُسے تھمایا اور دوسرا خود لے کر پوچھنے لگی۔

''اندر چلو گی یا یہیں بیٹھو گی؟''

''یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔'' وہ پیڑھی کو پیر سے آگے کھینچ کر بیٹھ گئی تو فہمی نے بھی اس کی تقلید کی۔ پھر کہنے لگی۔

''میں تو یہی کہوں گی بجی کہ ندا کو اس طرح نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگر اس کی ممی کی ڈیتھ ہوگئی تھی تو یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اور وہ ہمارے حالات کو بھی جانتی تھی۔ اُسے تمہارا خیال ضرور کرنا چاہیے تھا۔''

''تم کسی طرح اس کے گھر جا کر اس کے بھائی سے ملو۔ سیدھی طرح نہ مانے تو اس کا منہ توڑ دو۔'' فہمی پُرجوش لہجے میں بولی۔

''دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''اگر گھر سے نکلنے کا کوئی بہانا ڈھونڈ بھی لیں' تب بھی مجھے ٹھیک طرح سے ندا کا گھر یاد

نہیں ہے۔ ویسے میں ندا کے گھر جانے کا رسک لے بھی نہیں سکتی کیونکہ اس کا بھائی جس طرح حق جتا کر بات کرتا ہے۔ اگر اسی طرح اس نے مجھے روک لیا تو میں تو کہیں کی نہ رہوں گی۔''

''ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔'' فہمی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

''کیا؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''تم ابتسام بھائی سے ملو۔''

''ابتسام سے.....!'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہاں اُن کا کیا ذکر۔ تب فہمی سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''دیکھو ناں سجی! ہم دونوں کچھ نہیں کر سکتے۔ اماں اور ابا جی کو بتایا نہیں جا سکتا۔ لے دے کے وہی ابتسام بھائی رہ جاتے ہیں۔ تم اُن سے مل کر ساری بات انہیں بتا دو۔ مجھے یقین ہے اگر وہ کچھ نہ کر سکے تو بہت خاموشی سے کنارہ کشی کر لیں گے۔ میرا مطلب ہے..... بات پھیلے گی نہیں۔''

''اور اگر انہوں نے ابا جی سے کہہ دیا تو.....؟''

''نہیں کہیں گے۔ یہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ وہ بہت اچھے ہیں۔ اس کا اندازہ تمہیں اُن سے مل کر ہو جائے گا۔''

وہ کچھ دیر تک فہمی کی طرف دیکھتی رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' اس کی بات کا یقین کرے یا نہیں۔ اور فہمی اس کی کیفیت سمجھ کر بولی۔

''اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ ابتسام بھائی تم سے شادی سے انکار کر دیں گے تو میری بہن تم بھی تو یہی چاہتی ہو۔'' اُس نے شاکی نظروں سے دیکھا تو کہنے لگی۔

''میرا مطلب ہے فی الحال یہی چاہتی ہو۔''

''اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ..... میں اُن سے کیسے مل سکوں گی؟'' وہ یونہی نظریں چرا

ر پوچھنے لگی۔

''ہاں! اب سوچنے والی بات یہ ہے۔ بہر حال تم فکر مت کرو..... میں کوئی نہ کوئی کیب نکال ہی لوں گی۔'' فہمی نے اُسے اطمینان دلایا۔

پھر جس روز ابتسام آئے (جب سے بات طے ہوئی تھی وہ ہفتے میں ایک آدھ چکر لگا لیا کرتے تھے) فہمی نے اُن سے پتہ نہیں کیا کہا اور اگلے روز اماں کے گھٹنے دباتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

''اماں! میں اور سجی بازار چلے جائیں؟''

''کیا؟'' اماں نے یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

''دیکھیں ناں اماں! سجی کی شادی ہے۔ اگر ہم دونوں اپنی پسند سے کچھ چیزیں لے لیں گے تو قیامت تو نہ آ جائے گی۔''

''تمہارے ابا جی!''

''ابا جی تو شام میں آئیں گے۔'' وہ فوراً ابل پڑی۔ ''انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ بس آپ اجازت دے دیں۔ میری اچھی اماں!'' اماں کو سوچتے دیکھ کر مسکین سی شکل بنا کر بولی۔

''ہم نے آپ سے کبھی ضد نہیں کی۔ ورنہ ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ کم از کم اپنی ضرورت کی چیز تو خود لے آیا کریں۔ آخر اس میں برائی کیا ہے.....؟ سب لڑکیاں باہر نکلتی ہیں اور ابا جی نے تو ہمیں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔''

''لینا کیا ہے تمہیں؟'' اماں پر اس کی باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ پھر بھی ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

''میں شادی میں پہننے کے لیے کپڑے لے لوں گی۔ اور سجی کہتی ہے وہ جوتے اور پرس اپنی پسند سے لے گی۔'' وہ اماں کو آمادہ دیکھ کر خوش ہو کر بولی۔

''جاؤ گی کہاں؟''

''یہیں قریبی مارکیٹ۔ ویسے بھی کسی اور جگہ کا ہمیں پتہ نہیں ہے۔''

''لیکن تمہارے ابا جی.....!'' اماں کو خود بھی ابا جی کا ڈر تھا۔

''ہم جلدی آ جائیں گے اماں! بس آپ دیر نہ کریں۔ جلدی سے پیسے نکالیں۔''

''جلدی آ جانا۔'' اماں اُٹھتے ہوئے بولیں تو اس نے وہیں سے بجی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر اماں کے پیچھے اندر گئی اور ان سے پیسے لے کر پرس میں رکھتے ہوئے اس سے بولی۔

''ہاں! دیر مت کرنا ورنہ اپنے ابا جی کو جانتی ہو۔'' اماں اُن کے پیچھے دروازے تک مسلسل یہی جملہ دُہراتے ہوئے آئیں اور وہ بڑے تحمل سے سُنتی ہوئی نکلیں۔ کیونکہ یہی بہت تھا کہ اماں نے اجازت دے دی تھی۔ غالباً انہیں بجی کا خیال تھا جو اب کچھ ہی دنوں کی مہمان تھی۔

جس مارکیٹ کا اس نے ذکر کیا تھا وہ گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ پیدل ہی کا راستہ تھا۔ اس لیے وہ دونوں تیز قدموں سے چلنے لگیں۔ پہلا موڑ مڑی تھیں کہ ابتسام احمد گاڑی لیے سامنے آ گئے۔

''ابتسام بھائی!'' فہمی نے سرگوشی میں اُسے مطلع کیا تو اس نے بالکل غیر ارادی طور پر سر اونچا کر کے دیکھا۔ پھر فوراً فہمی کے پیچھے ہو گئی۔ اس کی اس حرکت پر وہ ذرا سا مسکرائے۔ پھر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

''آیئے۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ فہمی کا ہاتھ دبا کر آہستہ آواز میں بولی۔

''بس اب ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور خبردار ان سے کوئی بات چھپانا مت!'' فہمی نے اُسے دھکیل کر آگے کیا اور بتسام کے برابر بٹھا کر خود پیچھے بیٹھ گئی۔

''کہاں چلنا ہے؟'' وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ اس لیے آپ مجھے یہیں قریبی مارکیٹ پر اُتار دیجئے گا۔'' فہمی نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔

''اور انہیں.....؟'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولے۔

''یہ آپ انہی سے پوچھ لیں۔'' اُن کے انجان بننے پر فہمی بھی شرارت سے بولی جب کہ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں تیز اور ہاتھ ٹھنڈے۔

''بس مجھے یہیں اُتار دیں۔'' فہمی نے کہا تو انہوں نے گاڑی روک دی۔ پھر آناً فاناً فہمی اُتری اور اُن سے بھی کچھ کہا۔ اس کے بعد انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی کہ وہ بس دیکھتی رہ گئی۔ غالباً اس کے گمان میں نہیں تھا کہ فہمی اُسے یوں اُن کے ساتھ تنہا چھوڑ دے گی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ ذرا سی پلکیں اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ شفاف سڑک پر گاڑی پھیلتی جا رہی تھی اور اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ خود سے بات شروع کر سکے اور وہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بولے۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''جی!'' یہ اس کا جواب تھا۔

''فہمی بتا رہی تھی آپ کو کوئی ضروری بات کہنی ہے۔''

''جی!''

''گاڑی چلتے رہے یا کہیں روک دوں؟'' انہوں نے اسپیڈ آہستہ کرتے ہوئے اُسے دیکھ کر پوچھا۔

''بس ٹھیک ہے۔'' وہ یہی کہہ سکی۔

''کیا ٹھیک ہے؟''

''میرا مطلب ہے اسی طرح۔ رُکیں مت۔''

''چلیے تو آپ بھی رُکیں مت..... کہتی جائیں کیونکہ کل سے اب تک میں مسلسل قیاس کرتا رہا ہوں کہ ایسی کیا بات ہے جو بعد میں نہیں کہی جا سکتی اور میں بالکل نہیں سمجھ پایا۔''

''وہ ایسا ہے کہ.....'' جو کچھ سوچا تھا سب ذہن سے نکل گیا تو وہ بے حد پریشان ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ روشن، چمکتی ہوئی آنکھیں ونڈ اسکرین پر جمی ہونے کے باوجود اپنی طرف دیکھتی

لگ رہی تھیں۔ تب وہ سر جھکا گئی اور اندر ہی اندر اپنے آپ کو حوصلہ دیتے ہوئے بمشکل بولنے پر آمادہ ہوئی تو ندا کے گھر اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ سب کچھ کہہ سنایا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ اپنی باتوں کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے ایک نظر اُن پر ڈال سکتی۔ اور اگر جو وہ ذرا سی ہمت کر لیتی تو اُسی وقت جان لیتی کہ قریب بیٹھے ابتسام احمد اس کی باتوں پر بجائے حیران ہونے کے محظوظ ہو کر مسکرا کیوں رہے ہیں۔ اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اُسے تمام اندیشوں سے نکال لیں کہ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر روتے ہوئے بولی۔

''بہت کمینہ اور ذلیل شخص ہے وہ اور احسان فراموش بھی۔ میں نے ندا کے کہنے پر کئی بار اُسے فون کیا اور ہر بار اُس نے بڑی ڈھٹائی سے صاف منع کر دیا کہ وہ کبھی بھی اس بندھن کو نہیں توڑے گا۔'' اور اُن کے ہونٹ جو مسلسل خوبصورت مسکراہٹ کے حصار میں تھے۔ یکلخت وہ حصار ٹوٹ گیا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔

''آپ ہی بتائیے۔ میں کیا کروں...... کیسے ان سے پیچھا چھڑاؤں؟''

''آپ اُس سے پیچھا کیوں چھڑانا چاہتی ہیں؟''

انہوں نے سینے میں دبی سانس ہونٹوں تک آنے سے پہلے روک لی جس سے اُن کی آواز خاصی بوجھل ہو گئی تھی۔

''اس لیے کہ مجھے نفرت ہے اس سے۔ اگر کبھی وہ میرے سامنے آ گیا تو میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔ کسی کی مجبوری و بے بسی سے فائدہ اُٹھانا کہاں کی شرافت ہے بھلا؟'' لمحہ بھر کو انہوں نے سوچا...... اسی وقت اپنا آپ عیاں کر دیں اور کہیں اُس سے......

''سنجیدہ خانم! میں محبتوں کے ساتھ اس بندھن کو مضبوط کرنے جا رہا ہوں اور تم توڑنے کی بات کرتی ہو۔''

لیکن اس کے منہ سے اپنے لیے اتنے نفرت انگیز کلمات سُن کر اُن کے جذبوں پر اوس پڑ گئی حالانکہ دل اب بھی یہ کہنے کو مچل رہا تھا کہ وہ اسی روز اُن کے دل میں گھر کر گئی تھی جب نکاح

خد وہ مچل مچل کر رو رہی تھی۔ آنکھوں میں اُتری لالی اور کناروں پر پھیلتے کاجل نے اُسے کس ین بنا دیا تھا کہ وہ اس تمام عرصے میں ایک پل کو بھی اس کے تصور سے نکل نہیں پائے تھے۔

اگر بات ذرا سی خفگی کی ہوتی تو اُسے منانے کا تصور دلکش تھا لیکن یہ صورتِ حال خاصی ہ تھی۔ اگر اسی وقت اپنا آپ عیاں کر دیتے تو ہو سکتا ہے وہ مجبوری کے تحت ذرا سی نادم ہو کر تا کر لیتی جبکہ دل میں اُن کے خلاف نفرت وہ کدورت جس کا وہ اظہار کر رہی تھی اسی طرح در ہتی۔ اور ایسی مفاہمت بھری زندگی تو وہ ہرگز نہیں گزار سکتے تھے۔

مصنوعی چہروں اور غرض میں لپٹی محبتوں کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اس لیے تو ں کے لیے ہامی نہیں بھرتے تھے کہ ممی نے انہیں جتنی بھی لڑکیاں دکھائی تھیں وہ سب میک اپ وں میں اپنا آپ چھپائے ہوئے اور بعض ایسی تھیں جنہیں اُن کی بجائے ان کے اسٹیٹس سے ا تھی۔

بالآخر وہ ایک طرح سے ممی کی آخری خواہش کے پیشِ نظر شادی کے لیے رضامند ئے تھے اور یہ صحیح ہے کہ اس کی طرح انہوں نے بھی بحالتِ مجبوری ہامی بھری تھی۔ لیکن پھر جب ، دیکھا تو انہیں لگا تھا جیسے وہ مدتوں سے اسی کی تلاش میں ہوں۔ پھر اس تمام عرصے میں انہوں اس کے لیے کیا کچھ نہ سوچا تھا۔ اور انہیں یقین تھا کہ وہ بھی پوری سچائی اور ایمانداری سے اُن ساتھ محبت کرے گی لیکن وہ تو پہلے ہی مرحلے پر بڑی شدت سے نفرت کا اظہار کر گئی تھی جس انہیں خاصا شاک لگا۔

فوری طور پر سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ اُس سے کیا کہیں۔ اس پر اپنا آپ عیاں کرتے یا تے۔ ہر دو صورتوں میں محرومی تھی۔ بالآخر کتنی دیر سے سینے میں دبی سانس نے راستہ پا ہی لیا۔ ں کی قید سے یوں آزاد ہوئی کہ ہلکی سی آواز خاموشی کے پردے چاک کر گئی۔ اور وہ جو اُن کی ۔ سے کسی بھی بات کی منتظر تھی...... سوائے آنکھوں کے پوری جان سے متوجہ ہو گئی۔ انہوں نے سگریٹ سلگایا۔ پھر دو تین کش لینے کے بعد بولے۔

''اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

''سیدھی سی بات ہے۔ میں نکاح پر نکاح تو نہیں کر سکتی اور اب یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ چاہیں تو اس شخص سے مجھے نجات دلا دیں ورنہ پھر شادی سے انکار کر دیں۔''

''میرے انکار کرنے سے کیا آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟ میرا مطلب ہے آپ اُس کے ساتھ.....''

''نہیں۔'' وہ فوراً بول پڑی۔

''کیا حرج ہے جبکہ وہ ایسا ہی چاہتا ہے۔''

''پلیز! آپ ایسی کوئی بات نہ کریں۔'' اس نے ٹوک دیا اور وہ خاموش ہو گئے۔

اس دوران انہوں نے گاڑی واپسی کے راستے پر ڈال دی تھی۔ پھر جہاں فہمی کو چھوڑ تھا وہیں روک دی تو اس نے چونک کر پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اُن سے پوچھنے لگی۔

''آپ اس سلسلے میں کیا کریں گے؟''

''اس وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پھر بھی آپ اطمینان رکھیں۔'' وہ اُسے دیکھ کر ہلکے سے مُسکرائے تو وہ نظریں چُراتے ہوئے بولی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو زحمت دی۔''

''نیور مائنڈ!'' پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ''وہ سامنے سے فہمی نظر آ رہی ہے۔ اُسے بلانا ہے یا آپ اس کے پاس جائیں گی۔''

''میں جاؤں گی۔'' اس کے ساتھ ہی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتری۔ پھر شیشے میں جھک کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑے۔

''اگر آپ شکریہ ادا کرنا چاہتی ہیں تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''پھر بھی شکریہ.....!'' وہ کہہ کر پیچھے ہٹی۔ پھر فہمی کی طرف چل پڑی۔ انہوں نے کچھ دیر رُک کر اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہیں سے لوٹ گئے۔

اور اس سے تو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اطمینان رکھے لیکن اب اپنا اطمینان رخصت ہو تھا۔ اس انداز سے تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی متنفر ہو گی۔ اس کے برعکس ان کا تھا کہ جب وہ اسے بتائیں گے کہ وہی ندا کے بھائی ہیں جن کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا تو وہ یران ہو گی پھر جس طرح خفا ہو گی اسی طرح مان بھی جائے گی۔ لیکن وہ تو ندا کے بھائی کے ے میں کچھ سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ کمینہ، ذلیل، احسان فراموش اور نجانے کیا کچھ کہہ ڈالا۔ اگر وہ کے لیے اتنی اہم نہ ہو گئی ہوتی تو یقیناً اس کی خواہش کے مطابق فیصلہ سُنا دیتے لیکن اب ایسا فیصلہ کرنا اُن کے لیے ممکن نہیں تھا۔

بہر حال انہوں نے سوچا..... وہ اس کے دل پر چھایا نفرتوں کا غبار اپنی محبتوں سے نے کی کوشش کریں گے۔ اور ابھی تو نہیں البتہ جب وہ انہیں تسلیم کرنے لگے گی۔ تب وہ اسے ں گے کہ جس بندھن کو وہ نام نہاد اور مجبوری کا نام دیتی رہی ہے، اسے انہوں نے اول روز ہی سے تسلیم کرنے کے ساتھ مضبوط اور پائیدار بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

ابا جی نے شادی کی تاریخ طے کر دی تھی اور جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے اس کی نی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ابتسام احمد نے اس سلسلے میں ی کیوں اختیار کر لی ہے۔ جبکہ اُس روز تو انہوں نے کافی حد تک اطمینان دلا دیا تھا۔ وہ بار بار سے اُلجھ پڑتی۔

''تم نے پوچھا نہیں اُن سے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کیا کیا؟''

''کتنی بار تو بتا چکی ہوں۔ کہہ رہے تھے سب ٹھیک کر لوں گا۔'' بالآخر فہمی جھنجھلا گئی۔

''کب ٹھیک کریں گے؟ اب تو شادی میں بھی کم دن رہ گئے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ساری حال تو تم انہیں بتا چکی ہو اور وہ اطمینان سے تو نہیں بیٹھے رہے ہوں گے۔ یقیناً کچھ نہ کچھ

کیا ہوگا اور ہوسکتا ہے کوئی پرابلم ہو۔ میرا مطلب ہے ندا کے بھائی نے ہی.....''

''میں بھی یہی سوچتی ہوں۔'' وہ بال پڑی۔ ''اگر ایسی ہی بات ہے تو ابتسام کو انکار کر دینا چاہیے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ ایک نکاح کے ہوتے ہوئے دوسرا نکاح کیسے ہوگا؟''

''اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''تم اُن سے پوچھو تو سہی۔''

''وہ آئیں تب ناں! انہوں نے تو آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔'' پھر شرارت سے بولی۔ ''اب تم جا تو رہی ہو۔ خود ہی پوچھ لینا۔''

''کیا؟'' وہ اُسے گھورنے لگی۔ ''تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے؟''

''بس کرو بجی! مت اس طرح مجھے گھورو۔ کتنا ارمان تھا تمہاری شادی کا کہ یہ کروں گی وہ کروں گی اور تم ہو کہ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پریشان کر رہی ہو۔ نہ ہنسنے بولنے دیتی ہو نہ مذاق کرنے دیتی ہو۔ اور کون سے ہمارے دس بہن بھائی بیٹھے ہوئے ہیں جن کی شادیوں پر ہم اپنے ارمان نکالیں گے۔''

فہمی بولے جا رہی تھی اور وہ سناٹوں میں گھرتی چلی گئی۔

پھر یہ چند دن یوں گزرے کہ وہ چُپ چاپ ہر بات سُنتی اور ہر تیاری ہوتے دیکھتی رہی۔ اُس کے بعد اُس نے فہمی کو بھی نہیں ٹوکا جو خاصا جوش و خروش دکھا رہی تھی۔

''پتہ نہیں میرے نصیب میں کیا لکھا ہے؟'' آخر میں اُس نے بے بسی سے سوچا تھا۔ اور بے شمار اندیشوں میں گھری اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔

جب وہ ابتسام کے سنگ اُن کے گھر میں داخل ہوئی تو وہاں کچھ زیادہ گہما گہمی نہیں تھی۔ بس گنتی کے چند لوگ تھے۔ ایک خاتون اُسے حجلۂ عروسی میں لے آئیں۔ بیڈ پر بٹھا کر جب

س کا دوپٹہ وغیرہ ٹھیک کر رہی تھیں تو ساتھ ساتھ اپنا تعارف بھی کروانے لگیں۔

''میں ابتسام کی بھابھی ہوں۔ اُن کے چچازاد بھائی کی بیوی۔ ہمارا گھر یہاں سے یادہ دور نہیں ہے۔ اس لیے اب اکثر تم سے ملاقات رہے گی۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

''تمہارا جب کبھی اکیلے میں دل گھبرائے..... میرے پاس آجایا کرنا۔''

''کیا یہاں اور کوئی نہیں رہتا؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''اور کون ہو۔ ان کے والدین کی تو ڈیتھ ہو چکی ہے۔ بس ایک بہن ہے اور وہ باہر ہتی ہے۔''

''شادی میں نہیں آئیں؟''

''آنا تو تھا اُسے لیکن اُس کی ڈیلیوری ہونے والی تھی..... اس لیے نہیں آسکی۔ میرا یال ہے اب دو تین مہینے کے بعد ہی آئے گی۔'' پھر سیدھی کھڑی ہو کر اُس کا جائزہ لیتے ہوئے لیں۔

''ماشاءاللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو۔ تکیے سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ابتسام ہمانوں کو رخصت کر کے آتے ہی ہوں گے۔'' پھر جاتے جاتے بولیں۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو بتا دو۔''

''نہیں شکریہ۔''

''اچھا صبح ملاقات ہوگی۔''

وہ مسکرا کر شب بخیر کہتی ہوئی چلی گئیں تو وہ کچھ دیر تک بند دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ پھر جب یقین ہو گیا کہ وہ دوبارہ نہیں آئیں گی تو بہت آہستگی سے بیڈ سے اُتر کر ریسنگ روم میں آگئی۔ پھر زیورات اُتارتے اور لباس تبدیل کرتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل لجھتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ابتسام کا سامنا کیسے کرے۔ بڑی مشکل سے اپنے

آپ کو سمجھا بجھا کر ڈریسنگ روم سے نکلی تو پہلے مرحلے پر ہی ٹھٹھک کر رُک گئی۔ وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ اُسے دیکھا تو اطمینان بھرا سانس لیا۔ اور آپ ہی آپ دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیلنے لگی تھی کہ اس نے نروس سی ہو کر پلکیں جھکا لیں۔ گو کہ وہ اس وقت بڑی سنجیدگی سے اس سے بات کرنے آئے تھے لیکن شاید ماحول کا اثر تھا کہ بے اختیار اُس کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

''میں تو بڑا حسین تصور لے کر آیا تھا کہ اس مسہری پر کوئی بڑے سے آنچل میں اپنے آپ کو چھپائے میری آہٹوں کو اپنی دھڑکنوں کے ساتھ شمار کرتا ہوگا۔'' اُس نے شاکی نظروں سے دیکھا تو اُنہوں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ پھر گہری سانس لے کر بولے۔

''آپ کھڑی کیوں ہیں.....؟ بیٹھیں ناں!'' وہ مسہری کے کنارے قدرے تکلف سے بیٹھ گئی اور خود سے کچھ پوچھنے کے بجائے اُن کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ جبکہ اُنہوں نے پہلے سگریٹ سلگایا۔ پھر دو تین کش لینے کے بعد بولے۔

''مجھے احساس ہے کہ آپ نے یہ عرصہ بہت پریشانی میں گزارا ہوگا اور ہو سکتا ہے مجھ سے بھی متنفر ہو گئی ہوں۔''

''نہیں۔''

''کیا نہیں؟'' وہ اُس کی ہلکی سی آواز پر اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''میرا مطلب ہے میں پریشان ضرور رہی.....لیکن آپ سے.....'' وہ بات پوری نہیں کر سکی۔

''واقعی!'' انہیں خوشی ہوئی اور وہ اظہار بھی کر گئے۔ ''مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا۔ بہر حال اس تمام عرصے میں' میں اطمینان سے نہیں بیٹھا رہا۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کو اس بندھن سے نجات دلا دوں لیکن.....''

''لیکن.....!'' وہ سانس لینے کو رُکے تھے کہ وہ بے صبری سے بولی۔

''وہ شخص تیار نہیں ہوا۔ اُس کا کہنا ہے کہ وہ آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

''آپ نے اُسے بتایا نہیں کہ میں کبھی بھی اُسے تسلیم نہیں کروں گی۔''

اس کے لہجے میں جس طرح نفرت سمٹ آئی تھی اس سے وہ فوراً کچھ نہیں کہہ سکے۔ ت خاموشی سے اُٹھ کر ٹیبل تک گئے۔ گلاس میں پانی ڈالا لیکن پھر پیئے بغیر ہی دوبارہ آ کر بیٹھ گئے وہ کہنے لگی۔

''جب آپ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوا تھا تو پھر آپ نے شادی کی ہامی کیوں بھری؟''

''آپ کا مطلب ہے میں انکار کر دیتا؟''

''ہاں!''

''جتنی آسانی سے آپ ہاں کہہ رہی ہیں۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا سنجیدہ خانم! اس لیے لہ بات میری طرف سے شروع ہوئی تھی اور اس اسٹیج پر پہنچ گئی کہ اگر میں انکار کر دیتا تو آپ کے لدین کو پریشانی ہوتی۔'' وہ جز بز ہو کر ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی تو انہیں اس پر رحم کے بائے غصہ آنے لگا کہ وہ کیوں کٹھور ہے کہ انہیں بھی بری طرح نظر انداز کر رہی ہے۔

''پھر اب میں کیا کروں؟'' وہ اُن کے خاموش ہو جانے پر اُلجھ کر پوچھنے لگی تو وہ اُٹھتے وئے چڑ کر بولے۔

''آرام سے سو جائیں۔''

''جی!'' وہ اُن کے انداز اور لہجہ پر غور کرنے لگی اور بے خیالی میں نظریں بھی اُن ہی پر نائے بیٹھی تھی۔ تب انہیں کہنا پڑا۔

''آپ کا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس سارے قصے کی آپ کے والدین کو خبر نہیں ہونی چاہیے تو لمینان رکھیں.....انہیں خبر نہیں ہوگی۔ اور مجھ پر اعتماد کیا ہے تو صبر کے ساتھ انتظار بھی کریں۔ ب ٹھیک ہو جائے گا۔ چلیے اَب آپ سو جائیں۔ مزید اس مسئلے پر صبح بات کر لیں گے۔'' پھر تے جاتے پلٹ کر بولے۔

''البتہ آپ یہ فیصلہ ضرور کر لیجئے گا کہ کون سے نکاح کو قائم رکھنا چاہتی ہیں۔''

''میرے خدا!'' اُن کے جاتے ہی اُس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ ''عجیب آدمی ہیں..... کہتے ہیں میں سو جاؤں۔ بھلا ان کی باتیں مجھے سونے دیں گی؟''

پھر طویل سانس لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بہت دیر سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ ٹیبل کے پاس جا کر پانی پیا۔ پھر آ کر لیٹی تو از سرِ نو ان ساری باتوں کو سوچنے لگی۔ اُسے محسوس ہوا کہ ساری پریشانیوں کے باوجود اس کے اندر کہیں تھوڑا بہت اطمینان موجود ہے اور یہ اطمینان ابتسام احمد کی ذات کا مرہونِ منّت تھا۔

☆☆☆

رات دیر سے سونے کے باوجود صبح وہ معمول کے مطابق اُٹھی۔ اور شاید نیند کی کمی کے باعث ہی سر بوجھل ہو رہا تھا اور آنکھیں قدرے سرخی مائل..... اُس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا تو وہ لان میں چہل قدمی کرتے نظر آئے۔ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُن کا انداز سوچتا ہوا سا تھا۔ اور اس وقت تو اس نے غور نہیں کیا۔ البتہ جب اُن کے مقابل ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھی تب اُن کی غیر معمولی خاموشی کا نہ صرف احساس ہوا بلکہ اپنے آپ میں بڑا عجیب سا بھی محسوس کرنے لگی تھی۔ کچھ جھجکتے ہوئے سلائس کی پلیٹ اُن کے سامنے رکھی۔ پھر چائے بنانے لگی۔

وہ کن اکھیوں سے اُس کا جائزہ لینے لگے اور کیونکہ خود ڈسٹرب تھے اس لیے اُسے بھی چھیڑنے سے باز نہ رہ سکے۔

''پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے؟''

''کیسا فیصلہ؟'' فوری طور پر واقعی اُسے یاد نہیں آیا۔ اور وہ سمجھے قصداً انجان بن گئی ہے۔ جب ہی بغور اُسے دیکھنے لگے۔ صبح کے اُجالے میں اُس کا دھلا دھلایا چہرہ بلا کی سادگی لیے ہوئے تھا۔ تب اُنہیں کہنا پڑا۔

''غالباً رات میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کو ہم دونوں میں سے کسی ایک کو.....''

''ہاں!'' وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ ''مجھے اس سلسلے میں سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ فیصلہ تو اسی وقت اُس نکاح سے پہلے ہی ہو گیا تھا اور میں اب بھی اس پر قائم ہوں۔''

وہ کچھ دیر تک اس پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ پھر بظاہر چائے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

''آپ نے فیصلہ کر لیا۔ لیکن اگر اُس شخص نے کوئی دعویٰ کر دیا جس کے نتیجے میں اگر ہمارے نکاح کو فسخ قرار دے دیا گیا تب.....؟''

''تب.....؟'' ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ وہ چونک کر اُنہیں دیکھنے لگی اور پھر کتنی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ قدرے مطمئن سی تھی اور اب اُن کی بات سے پل میں سارا اطمینان چھین لیا تھا۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' انہوں نے کہا تو وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ سر جھٹک کر بولی۔

''کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟''

''بالکل! اگر وہ شخص علی الاعلان یہ دعویٰ کر دے کہ آپ اس کی بیوی ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ آپ اُس کے ساتھ روانہ ہو جائیں۔'' وہ پتہ نہیں اُسے ڈرا رہے تھے یا ایک بار پھر اپنے بارے میں کچھ سننا چاہتے تھے۔

''نہیں!'' وہ سر کو زور زور سے نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اُس کے ساتھ جانے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اول تو میں اُس نکاح کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ پھر بھی اگر اُس کی کوئی اہمیت ہے جس کے زور پر وہ کوئی دعویٰ کرے گا تو بدلے میں، میں بھی دعویٰ کر دوں گی اس سے فوری علیحدگی کا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''یہ کام میں پہلے بھی کر سکتی تھی لیکن ایک تو حالات اجازت نہیں دیتے تھے۔ دوسرے

کوئی میرے ساتھ نہیں تھا۔ اور اب تو ابتسام احمد آپ میرے ساتھ ہیں۔ آپ میری مدد کریں گے ناں!'' انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ پھر چائے کا کپ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔ ایک دو سپ لینے کے بعد کہنے لگے۔

''پہلے ناشتہ کرلیں' ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' اُس نے محض اُن کی بات رکھنے کی خاطر سلائس کی پلیٹ اپنی طرف کھسکالی۔ ورنہ کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اُنہوں نے بڑی عجلت میں چائے ختم کی اور کرسی کھسکا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اُسے ڈھنگ سے ناشتہ کرنے کی تاکید کرتے گئے۔

''اب کیا ہوگا؟'' وہ پھر اُلجھ گئی۔ ''اگر ابتسام کا خدشہ درست نکلا تب تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ پھر پہلے مجھے اس سے طلاق حاصل کرنی ہوگی۔ اس کے بعد پتہ نہیں ابتسام دوبارہ مجھ سے شادی پر تیار ہوں گے کہ نہیں۔ اللہ میاں میں تو مر جاؤں گی۔'' یہ ساری باتیں سوچ کر وہ رو دینے کو تھی کہ انہیں آتے دیکھ کر سنبھل گئی۔

''اس طرح پریشان ہونے اور رونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔'' اپنے طور پر وہ سنبھل چکی تھی لیکن چہرہ اندرونی کیفیت کا غماز تھا۔ جب ہی اُنہوں نے ٹوکا تو وہ ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو۔ ''میں کیا کروں؟''

''آپ ایک بار اُسے فون کریں اور پوچھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔''

''میں اُسے فون نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ بہت بدتمیز آدمی ہے۔ پتہ نہیں کیا کہہ دے۔''

''یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے کہ وہ کیا کہتا ہے۔''

''تو پھر آپ خود اس سے بات کرلیں۔''

''میں.....!'' انہوں نے قصداً تعجب کا اظہار کیا۔ پھر کہنے لگے۔ ''نہیں! اب آپ ہی

کو بات کرنی چاہیے۔ اس کے ارادے معلوم ہو جائیں' پھر میں کچھ کرسکوں گا۔''

''جی!'' وہ کچھ سوچتی ہوئی اُٹھ کر کمرے میں جانے لگی تو وہ پکار کر بولے۔

''میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ایک دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ اگر آپ کہیں تو آپ کو اباجی کے گھر چھوڑ دوں؟''

''نہیں۔'' وہ اسی قدر کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔ اپنے آپ کو عجیب مشکل میں محسوس کر رہی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ آخری بار جب اُس نے اُسے فون کیا تھا اور یہ پوچھا تھا کہ وہ کب اُسے اس بندھن سے نجات دلا رہا ہے تو جواب میں وہ کتنے اطمینان سے بولا تھا..... 'کبھی نہیں۔' اُسے اب بھی اپنے آس پاس کبھی نہیں' کبھی نہیں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں تو وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے ابھی اس سے بات کرلینی چاہیے۔ ابتسام بھی موجود نہیں ہیں۔ ورنہ اُن کے سامنے مشکل ہوگی۔''

اس نے سوچا اور فون کرنے کی غرض سے کمرے سے نکلی ہی تھی کہ ابتسام کی بھابھی آ گئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ جز بز تو ہوئی لیکن بظاہر مسکرا کر استقبال کیا۔

''تم ایک رات کی دلہن کن کاموں میں اُلجھی ہو۔'' وہ اُسے گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

''کام تو کوئی نہیں ہے۔'' وہ اُن کے ساتھ چلتی ہوئی لاؤنج میں آ بیٹھی تو وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''ابتسام کہاں ہے؟''

''وہ کسی ضروری کام سے ابھی نکلے ہیں۔''

''اُس کے ضروری کام کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اور ہاں فون پر اُس نے بتایا ہے کہ ولیمے کی تقریب ملتوی کردی ہے۔''

''جی!''

''کیوں؟''

''اُن کی ایک ہی تو بہن ہے۔ اُن کا کہنا ہے اُس کے آنے پر کوئی تقریب کر لیں گے۔'' اُسے ابتسام نے کہا تھا' اُس نے وہی کہہ دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ دو تین مہینے بعد آئے گی تو کیا اس وقت ولیمہ ہوگا؟''

''ولیمہ نہیں..... بس کوئی بہانہ ہو جائے گا۔'' پھر اس موضوع سے ہٹنے کی خاطر بولی۔

''آپ چائے پئیں گی یا.....؟''

''نہیں بھئی! میں ابھی ناشتہ کر کے آ رہی ہوں۔ بلکہ میں تو یہ دیکھنے آئی تھی کہ تم لوگوں نے بھی ناشتہ کیا یا نہیں۔''

''جی کر لیا۔''

''اور یہ تم نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔ اگر اس وقت تمہارے میکے سے کوئی آ جائے تو کیا کہے۔'' وہ اُس کے سادہ کپڑوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں تو اُس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

''چلو! میں تمہارے لیے کوئی دوسرا سوٹ نکالتی ہوں۔''

''ابھی نہیں بھابھی! شام میں پہن لوں گی۔''

اس نے بڑی مشکل سے انہیں روکا۔ پھر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ تو اُسے اُلجھن ہونے لگی۔ بار بار اُن کی نظر بچا کر گھڑی کی طرف دیکھتی۔ ابتسام کو گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی اُن کے آنے سے پہلے ندا کے بھائی کو فون کر لے۔ لیکن بھابھی جیسے فراغت سے آ بیٹھی تھیں۔ عام حالات میں تو وہ اُن کے خلوص کی معترف ہوتی لیکن اب کیونکہ وہ اپنے مسئلے میں اُلجھی ہوئی تھی۔ اس لیے اُن کا جم کر بیٹھنا ناگوار گزر رہا تھا۔ پھر بھی کوشش یہی تھی کہ ناگواری یا بیزاری ظاہر نہ ہو۔ اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی تھی لیکن دھیان سے

ن کی باتیں نہیں سُن پا رہی تھی۔ کسی وقت وہ اپنی کسی بات کا جواب مانگتیں' تب وہ ہونقوں کی رح دیکھنے لگتی۔ پھر خجالت مٹانے کو یونہی سر ہلانے لگتی۔

''تم کچھ تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ میرا خیال ہے نیند پوری نہیں ہوئی۔'' آخر وہ خود ہی سمجھ کر کہنے لگی۔

''نہیں بس!'' اُس نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

''ابتسام نے بھی صبح جا،) اُٹھا دیا ہوگا۔ وہ تو ایسا ہی ہے دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے س کی روٹین چینج نہیں ہو سکتی۔'' پھر اُٹھتے ہوئے بولیں۔ ''میں چلتی ہوں۔ ابتسام سے کہنا شام بس تمہیں لے کر میری طرف آئے۔''

''جی! لیکن آپ جا کیوں رہی ہیں..... بیٹھیں ناں! ابتسام ابھی آتے ہوں گے۔''

اُس نے اخلاقاً روکا۔

''نہیں' بس اب چلوں گی۔'' وہ انہیں چھوڑنے باہر تک آئی۔ پھر واپسی میں ٹیلی فون سیٹ اپنے کمرے میں اُٹھا لائی۔ اور جلدی جلدی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اُمید تو نہیں تھی کہ ندا کے بھائی گھر پر ہوں گے۔ پھر بھی اس نے سوچا' وہ آئندہ کے لیے میسج دے دے گی۔ دوسری طرف مسلسل بیل جا رہی تھی۔ وہ انتظار کرنے لگی۔ پھر جیسے ہی کسی نے ریسیور اُٹھایا' وہ بڑی عجلت میں بول پڑی۔

''ندا کے بھائی ہیں گے؟''

شاید وہ ملازم تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دفتر گئے ہیں تو اُس نے دفتر کا نمبر پوچھا۔ اُس نے ہولڈ کرنے کو کہا اور پھر کچھ دیر بعد دفتر کا نمبر بتا دیا تو اُس نے دفتر فون ملا لیا۔

''ہیلو!''

''کون..... سنجیدہ خانم!'' لہجے میں قدرے غیر یقینی کے ساتھ اشتیاق بھی تھا۔ اور وہ اُس کے فوراً پہچان لینے پر دل ہی دل میں قائل ہوتے ہوئے بولی۔

''جی..... میں ہی ہوں۔''

''کہیے اتنے دنوں بعد کیسے ہماری یاد آ گئی؟'' وہ یوں بولا جیسے اس سے بڑی اچھی دوستی ہو۔

''مجھے ندا کا فون نمبر چاہیے۔'' وہ اچانک اُس سے بات کرنے کا ارادہ ترک کر گئی۔

''خیریت! کیا میری شکایت کریں گی؟''

''میرے پاس ایسی فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ بس آپ نمبر دیں۔'' وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

''ابھی لیجیے!'' وہ نمبر بولنے لگا اور وہ جلدی جلدی نوٹ کرنے لگی۔

''اور کوئی حکم؟''

''جی نہیں شکریہ۔'' وہ فون رکھنے لگی تو وہ بول پڑا۔

''ایک بات تو بتایئے! میں بارات لے کر کب آؤں؟''

''شٹ اَپ!'' وہ تقریباً چیخی اور ریسیور پٹخ دیا۔ اُسے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا سامنے جا کر اُس کا منہ نوچ لے۔ کتنے اطمینان سے بات کرتا تھا۔ ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی مشکل میں ہے۔ دل ہی دل میں اُسے بے شمار گالیاں دیتی ہوئی اُٹھی تو پہلے ٹیلی فون سیٹ لے جا کر لابی میں رکھا۔ پھر کچن میں آ کر خانساماں سے دوپہر کے کھانے کے بارے میں پوچھنے لگی۔

☆☆☆

اگلے کئی دن ندا کو فون کرنے کی کوشش میں صرف ہو گئے۔ اس کا نمبر مل کے نہیں دے رہا تھا۔ اور اب تو اُسے ابتسام احمد کے سامنے بے حد خجالت محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ وہ دن میں ایک بار بڑی سنجیدگی سے اُس سے پوچھتے تھے۔

''ندا سے بات کی آپ نے؟''

''میں نے بہت کوشش کی لیکن.....'' اُن سے نظریں چُراتے ہوئے وہ اس قدر کہہ کر خاموش ہو گئی تو اُنہوں نے مشورہ دیا۔

''اگر آپ سے نمبر نہیں مل رہا تو کال بک کرا لیں۔''

''آپ..... میرا مطلب ہے آپ یہ کام کر دیں۔''

''میں ندا سے بات کروں؟'' انہوں نے متعجب ہو کر اپنی طرف اشارہ کیا تو وہ سٹپٹا کر بولی۔

''نہیں! بات تو میں کر لوں گی۔ بس آپ کال بک کرا دیں یا پھر کوشش کریں۔ شاید آپ سے نمبر مل جائے۔''

''اچھی بات ہے۔ لایئے نمبر۔'' وہ اسی وقت تیار ہو گئے تو وہ جلدی سے کمرے میں جا کر ندا کا نمبر لے آئی۔ چھوٹا سا کاغذ اُن کے سامنے ٹیبل پر رکھا۔ پھر بظاہر سائیڈ سے میگزین اُٹھا کر اُس کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔ وقفے وقفے سے کن اکھیوں سے انہیں بھی دیکھ لیتی جن کی انگلیاں مسلسل ڈائل پر حرکت کر رہی تھیں۔ پھر اچانک خاموشی چھا گئی اور چند لمحوں بعد ان کی آواز سُنائی دی۔

''ہیلو! آپ کون ہیں؟'' وہ میگزین رکھ کر پوری طرح اُن کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''ندا سے کہیے پاکستان سے اُن کی کال ہے۔ سنجیدہ خانم بات کریں گی۔'' پھر اشارے سے اُسے قریب بلا کر ریسیور اُسے تھما دیا اور خود اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہیلو کون بجی!'' ندا کھنکتی ہوئی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ اُس نے فوراً جواب نہیں دیا۔ جب ابتسام وہاں سے چلے گئے تب گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں! میں ہوں۔''

''کیسی ہو بجی؟ بلکہ اب تو تمہیں بھابھی کہنا چاہیے۔'' ندا شوخی سے بولی تو وہ دبی دبی

آواز میں چیخی۔

''کیا؟'' پھر دانت پیستے ہو ''خبردار جو مجھے بھابھی کہا۔''

''کیوں.....؟ تمہیں پسند نہیں ہے کیا؟''

''یہ مذاق چھوڑو ندا! اور مجھے بتاؤ کہ تمہارا بھائی کیا چاہتا ہے؟''

''میرے بھائی تمہیں اپنانا چاہتے ہیں اور وہ.....''

''یہ ناممکن ہے۔'' وہ فوراً بول پڑی۔ ''اور سنو ندا! تم لوگ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اور تمہارا بھائی مجھے دھوکہ دو گے تو میں کبھی تمہارے گھر آتی بھی نا۔''

''ہم نے تمہیں دھوکہ نہیں دیا بجی! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں سب سمجھ چکی ہوں کہ تم کبھی بھی میری دوست نہیں تھیں۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ اگر دوستی کا دعویٰ ہے تو اپنے بھائی سے کہو میری مجبوری سے فائدہ نہ اُٹھائے۔ جو بات اول روز تم نے اور تمہاری کزن نے طے کی تھی اُس پر فوراً عمل کرو ورنہ مجھے مجبوراً کورٹ سے رجوع کرنا پڑے گا۔''

''میری بات سنو بجی!'' ندا نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ ''اُس وقت حالات ہی ایسے تھے۔ ہماری عقل بالکل کام نہیں کر رہی تھی۔ تمہارے رونے دھونے اور ڈرنے سے ہم اس کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہیں سکے۔ اور اب تمہارے بارے میں سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس بندھن کو توڑنے کی بجائے مضبوط کر لینا چاہیے۔ ویسے بھی بھائی جان کا کہنا ہے کہ انہیں جس لڑکی کی تلاش تھی، وہ تم ہو۔''

''خدا کے لیے ندا.....!'' وہ سچ مچ چیخ پڑی۔ ''ایسی باتیں مت کرو۔ پتہ بھی ہے اب میری شادی ہو چکی ہے۔''

''کیا!'' ندا کے منہ سے بھی چیخ نما آواز نکلی تھی۔

''ہاں! ابتسام احمد میرے شوہر ہیں۔ میں نے اول روز ہی انہیں ساری بات بتا دی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ انہوں نے نہ صرف سنجیدگی سے میری بات سُنی بلکہ اب مجھے موقع بھی دے رہے ہیں کہ میں تمہارے بھائی سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ ورنہ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اسی وقت کھڑے کھڑے مجھے اپنے گھر سے نکال دیتا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''اب میں اکیلی نہیں ہوں۔ ابتسام میرے ساتھ ہیں۔ اول تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ بات سے یہ مسئلہ حل ہو جائے ورنہ ہمیں دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''لیکن بجی!'' وہ اُس کی بات سُنے بغیر بول پڑی۔

''میرا نمبر لکھ لو اور اپنے بھائی سے بات کر کے جلدی مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کہتا ہے۔'' پھر نمبر بتانے لگی۔

''تم نے میرے بھائی جان سے بات کی تھی؟'' ندا نمبر نوٹ کرنے کے بعد پوچھنے

''ہاں! ایک بار نہیں کئی بار.....اور معاف کرنا ندا تمہارے بھائی جان بہت بدتمیز انہیں میری مجبوری کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔''

''نہیں.....ایسی بات نہیں ہے۔''

''ندا صفائی میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ ابتسام اس کی طرف آتے۔ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس وقت وہ اُن کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ وہ پوچھیں گے ندا سے کیا بات ہوئی اور ندا نے خود اُسے کوئی اضافی جواب نہیں دیا تھا۔ تو وہ انہیں کیا بتاتی۔ اُسے ندا پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی طرفداری کرنے لگی تھی۔ بہرحال اس بار اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دو دن کے بعد ہی ندا کا فون آ گیا جس کی وہ شدت سے منتظر تھی۔ اور اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ کہنے لگی۔

''سنو! میں نے اپنے بھائی جان سے بات کی ہے اور وہ کسی طرح بھی تمہیں چھوڑنے

پر آمادہ نہیں ہیں۔'' اُس کا دل تو چاہا اُسے بے نقط سنائے لیکن اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''تم نے انہیں بتایا نہیں کہ میری شادی ہو چکی ہے؟''

''بتایا تھا اور اس پر تو وہ بہت ہی خفا ہو رہے تھے۔ کہہ رہے تھے' میرے نکاح میں ہوتے ہوئے وہ کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی۔ اور یہ بھی کہا کہ میں اس پر تو نہیں اس کے میاں پر دعویٰ کر دوں گا کہ.....''

''بس کرو ندا.....!'' اس نے فوراً ٹوک دیا۔ جس بات کا ڈر تھا وہی ہو رہی تھی۔

''اب بتاؤ میں کیا کروں؟'' ندا پوچھنے لگی۔

''تم کیا کر سکتی ہو؟ اب تو جو کرنا ہوگا میں خود ہی کروں گی۔''

اُس نے تلخی سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر اِدھر وہ تو یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ اور اُدھر ابتسام اطمینان سے فون پر ندا سے بات کر رہے تھے۔ ندا انہیں اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو سُنانے کے بعد کہنے لگی۔

''بس کریں بھائی! وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔ اب ختم کریں یہ ڈرامہ.....''

''تم اسے ڈرامہ کہتی ہو۔ بخدا! میرا اُسے تنگ کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ وہ تو اُس کے منہ سے نفرت انگیز کلمات سُن کر مجھے اپنا آپ چھپانا پڑا۔ ورنہ میں اسی وقت بتا دیتا کہ میں کون ہوں۔''

''بہر حال..... میرے آنے سے پہلے ہی آپ سب ٹھیک ٹھاک کر لیں ورنہ وہ مجھ سے بہت لڑے گی۔''

''میں کوشش کروں گی کہ.....'' اُسے آتے دیکھ کر اُنہوں نے بات وہیں چھوڑ دی اور جلدی سے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر اُس کے قریب آنے پر بغور اُسے دیکھتے ہوئے بولے۔

''کیا بات ہے۔ کچھ پریشان ہیں؟''

''ہاں!'' اُس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ پھر قدرے تکلف سے صوفے پر ہوئے بولی۔

''میں ندا سے بات کر چکی ہوں۔ میرا خیال ہے وہ اپنے بھائی کو سمجھانے میں ناکام ہے۔''

''پھر؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ جو اپنے طور پر اُس مسئلے کا حل سوچ چکی س کے مطابق کہنے لگی۔

''آپ مجھے کچھ دنوں کے لیے اماں کے گھر چھوڑ دیں۔''

''کیوں؟'' وہ ٹھٹکے۔

''کیونکہ میں سمجھتی ہوں میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ ابھی تو یہ بھی ں ہوا کہ میری آپ کے ساتھ شادی صحیح ہے یا نہیں۔ بس آپ مجھے اماں کے گھر جانے میں پہلے اس شخص سے نمٹ لوں' اس کے بعد دیکھا جائے گا۔''

''کیا کریں گی آپ؟'' وہ فوراً پوچھنے لگے۔

''اُس سے خلع لوں گی۔''

''دیکھئے سنجیدہ خانم!'' وہ اس کی پوری بات سُنے بغیر بول پڑے کیونکہ ایک تو وہ اُس کی ھ چکے تھے۔ دوسرے یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں وہ اپنی بات پر قائم رہ کر ضد نہ کر بیٹھے۔

''آپ کچھ دنوں کے لیے اپنی والدہ کے گھر جانا چاہیں تو ضرور جائیں لیکن میں اس کی نہیں دوں گا کہ آپ کورٹ کچہری کے چکر لگاتی پھریں۔''

''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ سب آپ کریں۔ میں جو ہوں۔'' وہ اٹھا کر دیکھنے لگی تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''میں اب تک اس مسئلے سے الگ اس لیے رہا کیونکہ میرا خیال تھا کہ آپ کی دوست

آپ کے ساتھ تعاون کرے گی۔ لیکن اب جب کہ معاملہ بجائے سلجھنے کے اُلجھنے لگا ہے تو میں محض تماشائی نہیں بن سکتا۔ آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ وہ شخص آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔''

''ندا کہہ رہی تھی وہ آپ پر کوئی دعویٰ کرنے والا ہے۔'' وہ کچھ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ بس آپ مطمئن سے ہو جائیں۔'' انہوں نے بہت یقین سے کہا۔ پھر اُٹھتے ہوئے بولے۔

''چلئے! تیار ہو جائیں۔ میں آپ کو ابا جی کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ آپ اطمینان سے کچھ دن وہاں رہیں۔ جب واپس آئیں گی تو انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔''

وہ ممنون نظروں سے انہیں دیکھتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی اور بیگ نکال کر اس میں اپنے کپڑے رکھنے لگی۔

☆☆☆

شادی کے بعد وہ اماں کے گھر آتی تو رہی تھی لیکن کچھ دن رہنے کی غرض سے پہلی بار آئی تھی اور سب سے زیادہ خوش فہمی تھی کیونکہ اس کے جانے سے وہ بالکل اکیلی ہوگئی تھی۔ بار بار اُس کے گلے میں بازو ڈال کر کہتی۔

''ایمان سے بجی! میں تو دیواروں سے باتیں کر کر کے اُکتا گئی ہوں۔''

''یہی حال میرا بھی ہے۔'' اُس کے منہ سے بنا سوچے نکل گیا۔ پھر اماں کو دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

''تم بھی.....؟'' ممی نے بات سنبھالنے کی غرض سے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

''کیا ابتسام بھائی گونگے ہیں؟''

''اللہ نہ کرے۔'' وہ مسکرائی۔ ''اب سارا دن تو وہ گھر پر نہیں ہوتے ناں! صبح کے گھر سے گئے شام کو آتے ہیں۔''

''سارا دن تم کیا کرتی رہتی ہو؟''

''کچھ نہیں بس بور ہی ہوتی رہتی ہوں۔ کسی کسی دن اُن کی بھاوج آجاتی ہیں تو کچھ وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ البتہ شام میں ابتسام کہیں نہ کہیں لے جاتے ہیں تو سارے دن کی بوریت دور ہو جاتی ہے۔'' آخر میں اُسے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

''چلو! تمہاری بوریت دور تو ہوتی ہے جبکہ یہاں تو اب تک وہی عالم ہے۔ ایک دن ابا جی سے کہا مجھے تمہارے ہاں لے چلیں تو بگڑ کر بولے تھے۔ کیا ضرورت ہے.....؟ تم وہاں جا کر کیا کرو گی؟ بجی سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے تو وہ خود چکر لگا جائے گی۔''

فہمی ابا جی کے لہجے کی نقل اُتارتے ہوئے بولی تو وہ اماں سے پوچھنے لگی۔

''کیوں اماں! کیا ابا جی میرے گھر بھی نہیں آنے دیتے؟''

''تمہیں پتہ تو ہے وہ کسی کے گھر نہیں جانے دیتے۔''

''میں کسی نہیں ہوں اماں اور پھر میرے کون سے اتنے سسرال والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اکیلا گھر ہے۔ اگر فہمی آجائے گی تو کون سی قیامت آجائے گی۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بولی تو اماں کو کہنا پڑا۔

''یہ بات نہیں ہے۔ اب تمہارے ابا جی صبح کے گئے شام کو آتے ہیں۔ اس کے بعد اُن میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ اسے کہیں لے جائیں۔'' اس کا دل چاہا کہہ دے آپ لے آیا کریں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش رہی۔ البتہ فہمی منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی تھی۔ اور جب اماں اُٹھ گئیں تب فوراً سرگوشی میں پوچھنے لگی۔

''اور بجی! اُس کا کیا ہوا؟''

''ابھی تک تو معاملہ وہیں اٹکا ہوا ہے۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''ابتسام بھائی کیا کہتے ہیں؟''

''اب تک تو انہوں نے مجھے چھوڑا ہوا تھا۔ میں نے ندا سے فون پر بات کی لیکن وہ بھی

اپنے بھائی کی طرح نکلی۔ تب ابتسام کہنے لگے۔ اب وہ خود دیکھ لیں گے' دیکھو کیا کرتے ہیں۔''

''ندا ایسی لگتی تو نہیں تھی۔ اور مجھے تو لگتا ہے اُس نے شروع ہی سے تمہارے خلاف کوئی سازش کر رکھی تھی۔''

''پتہ نہیں۔'' پھر اماں کو آتے دیکھ کر فہمی کو اشارہ کرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔

اگلے دن شام میں ابتسام آئے۔ کچھ دیر ابا جی کے پاس بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ چائے لے کر گئی تو اُس سے کہنے لگے۔

''کہیں آؤٹنگ کے لیے چلیں گی؟'' وہ ابھی جواب نہیں دے پائی تھی کہ کہنے لگے۔

''میں چائے پی لوں' پھر چلتے ہیں۔ فہمی کو بھی ساتھ لے لیجئے گا۔'' وہ اجازت طلب نظروں سے ابا جی کی طرف دیکھنے لگی تو غالباً انہیں ابتسام کی وجہ سے کہنا پڑا۔

''ہاں ہاں! لے جاؤ فہمی کو بھی۔'' اُس نے کچن میں آ کر فہمی کو بتایا تو وہ اُچھل پڑی۔

''سچ کہہ رہی ہو؟''

''ہاں!''

''ایک بار پھر پوچھ آؤ۔ میرا خیال ہے تمہارے سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔''

''پاگل مت بنو!'' وہ خواہ مخواہ چڑ گئی۔ ''چلنا ہے تو چلو..... ورنہ صاف منع کر دو۔''

''ارے واہ! میں کیوں منع کروں گی۔ زندگی میں پہلی بار تو ابا جی مہربان ہوئے ہیں۔''

فہمی فوراً تیار ہونے چلی گئی۔

''ایک بار مجھ پر بھی مہربان ہوئے تھے۔'' اس نے سوچا اور اُسے ندا کی شادی یاد آئی۔ پھر جو کچھ اُس کے ساتھ ہوا تھا۔

''کیا بات ہے..... چلنا نہیں ہے؟'' وہ ابھی تک اُسی دن کو سوچ رہی تھی کہ ابتسام کی آواز پر چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ کیونکہ ذہن ابھی تک اُسی واقعہ کی گرفت میں تھا۔ اس لیے بے خیالی میں اُن پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔

''کوئی پرابلم ہے؟'' وہ براہِ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''نہیں!'' نہیں کی صورت گہری سانس لی۔ پھر اُن کے پیچھے نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''پتہ نہیں فہمی کہاں رہ گئی۔ ٹھہریے میں دیکھتی ہوں۔'' وہ کچن سے نکلنے لگی کہ وہ دروازے میں راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ گو کہ قصداً دیوار بنے تھے لیکن جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے انجان بن کر بولے۔

''یہاں ماچس ہوگی؟''

''ہاں!'' وہ فوراً پلٹی اور ریک پر سے ماچس اُٹھا کر ان کی طرف بڑھا دی۔ جسے لے کر اُنہوں نے سگریٹ سلگایا۔ پھر اُس کی طرف دیکھ کر بولے۔

''اگر آپ یہاں کبھی اسی طرح پریشان رہیں تو مجبوراً مجھے اسی وقت آپ کو گھر لے کر جانا پڑے گا۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی بلکہ اُن سے پوچھنا چاہتی تھی کہ انہوں نے اس سلسلے میں کیا کیا کہ فہمی کے آنے سے خاموش ہو رہی۔ اور وہ فہمی کو دیکھ کر بولے۔

''چلیں؟''

''جی!'' فہمی نے انہیں راستہ دیا۔ پھر اُس کے ساتھ چلنے لگی۔

''کب تک آؤ گی؟'' برآمدے میں اماں انہیں روک کر پوچھنے لگیں۔

''جانے تو دیں اماں! واپس بھی آ جائیں گے۔'' اس سے پہلے فہمی بول پڑی۔ اور اماں کے گھورنے پر ہنستی ہوئی اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

''ہاں بھئی فہمیدہ خانم.....! آپ بتائیں کہاں چلیں گی؟'' انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا تو فہمی منہ بنا کر بولی۔

''مجھ سے نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔''

''کیوں بھئی؟''

''اس لیے کہ میرے لیے تو ہر جگہ ہی نئی ہے' جہاں بھی لے چلیں گے۔''

''یہ ایسی ہی باتیں کرے گی۔'' وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

''بس کہیں بھی چلیں۔''

''ہوسکتا ہے جہاں میں لے چلوں' وہاں آپ دونوں بور ہوں۔''

''بے فکر رہیں۔ ہم کہیں بھی بور نہیں ہوں گے۔'' فہمی نے پھر بولنا ضروری سمجھا تو وہ ایک نظر اس پر ڈال کر سامنے متوجہ ہوگئے۔

پھر شام کا وقت اُنہوں نے ساحل کی گیلی ریت پر چہل قدمی کرتے گزارا۔ نمی لہروں کا تعاقب کرتے ہوئے آگے تک چلی گئی تھی۔ اس دوران اُنہوں نے اُسے بتایا کہ آج اُنہوں نے ایک وکیل سے مشورہ کیا تھا۔ اور اس کے کہنے پر ہی اُس کی طرف سے خلع کا نوٹس ندا کے بھائی کو بھجوا دیا گیا ہے۔ پھر اُنہوں نے اُسے اطمینان دلایا کہ جلد ہی یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور وہ کسی حد تک مطمئن ہوگئی تھی۔ پھر واپسی میں اُنہوں نے چائنیز میں کھانا کھایا۔ اور تقریباً دس بجے کے بعد گھر آئے تھے۔

اُن کا خیال تھا ان دونوں کو چھوڑتے ہی چلے جائیں گے لیکن فہمی نے انہیں چائے کے لیے روک لیا۔ اور اس وقت انہوں نے چائے اماں کے ساتھ بیٹھ کر پی۔ اماں کی باتیں خالص گھریلو قسم کی تھیں۔ جن میں زیادہ تر تذکرہ فہمی کی شادی کا تھا۔

ڈھکے چھپے الفاظ میں وہ ایک طرح سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھیں کہ ابتسام جیسا رشتہ فہمی کے لیے بھی مل جاتا تو وہ اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جاتیں۔ ابتسام خاصے سعادت مند بنے توجہ سے اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔ جبکہ وہ اپنی جگہ پہلو بدلتے ہوئے خاصی جز بز ہو رہی تھی کیونکہ اس کے خیال میں ابتسام کے سامنے ایسی باتیں فی الحال مناسب نہیں تھیں۔ فہمی چائے لے کر آئی' تب اُس نے شکر کیا کیونکہ اس کے آنے سے اماں نے موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ پورا ایک ہفتہ اماں کے گھر رہی۔ ابتسام روزانہ شام میں کچھ دیر کے لیے آ جاتے تھے۔ پھر ہفتے بعد انہوں نے ہی اُسے چلنے کے لیے کہا۔ اُس کے پاس مزید رُکنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ اس لیے اُن کے ساتھ چلی آئی۔ یہاں وہی بور کر دینے والے دن تھے۔ سارا دن وہ یونہی اِدھر سے اُدھر چکراتی رہتی۔ کوئی کام کرنے کی کوشش بھی کرتی تو دل نہیں لگتا تھا۔ ایک دو بار ندا کا فون آیا اور وہ اس سے بھی کچھ ایسی خفا تھی کہ اُس کی آواز سُنتے ہی فون بند کر دیتی۔ اُس کے اندر عجیب سی بے کلی سما گئی تھی۔

وہ ناشتے کی ٹیبل پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ابتسام فون پر پتہ نہیں کس سے بات کر رہے تھے۔ وہ گاہے بگاہے ان پر نظر ڈال لیتی۔ غالباً انتظار میں تھی کہ وہ آئیں تو ناشتہ شروع کرے۔ اور جب وہ آئے تو کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہی کہنے لگے۔

''بھئی صبح ہی صبح بہت اچھی خبر سننے کو ملی۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو کہنے لگے۔

''مابدولت ماموں جان بن گئے ہیں۔''

''اچھا! کیا ہوا ہے؟'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''بیٹا!''

''اور بے بی کیسی ہے؟'' وہ ندا کو بے بی کہتے تھے۔

''ٹھیک ہے اور اب انشاء اللہ وہ ایک ڈیڑھ مہینے تک یہاں آئے گی تو آپ کی ساری بوریت دور ہو جائے گی۔ بہت باتونی ہے وہ۔''

''اچھا!'' وہ گھر میں اُس کی آمد کا تصور کر کے ہی خوش ہوگئی۔ پھر اُن کے آفس جانے کے بعد اُسی وقت سے وہ اُس کے لیے کمرہ ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگ گئی۔ گو کہ ابھی اُسے آنے میں کافی دن تھے لیکن یہ مصروفیت اُسے اچھی لگ رہی تھی۔ اس لیے بہت دیر تک وہ اس کام میں مصروف رہی۔ درمیان میں کسی کسی وقت کچن میں بھی جھانک آتی تھی۔

دوپہر تک وہ کمرے کو پوری طرح سیٹ کر کے فارغ ہوگئی۔ پھر شاور لے کر اُس کے بعد کھانا کھایا۔ اور کچھ دیر سونے کی غرض سے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ فون کی بیل سُن کر لابی میں آ گئی۔

''ہیلو!'' ریسیور کان سے لگاتے ہی اُس نے ہیلو کہا تو دوسری طرف ابتسام غالباً اُسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھے۔ اُسی پرانے لہجے میں آواز بدل کر بولے۔

''بھئی آپ جتنے مرضی دعوے کر لیں' میں اپنا حق ثابت کر کے دکھاؤں گا۔''

''تم.....!'' وہ ایک دم آپے سے باہر ہوگئی۔ ''تمہیں جرات کیسے ہوئی مجھے فون کرنے کی اور یہ تم نے میرا نمبر کہاں سے لیا ہے؟''

''نمبر.....!'' وہ ہنسا۔ ''آپ کے شوہر نامدار نے خود مجھے نمبر دیا ہے تا کہ میں آپ کو رام کر سکوں۔''

''کیا؟'' وہ چیخی۔

''جی ہاں!'' وہ اطمینان سے بولا۔ اصل میں ابتسام صاحب آپ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔''

''ابتسام!'' وہ اس کی بات پر سناٹے میں آ گئی۔

''جی! بیچارے شریف آدمی ہیں۔ اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اس لیے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو اپنے حق میں ہموار کر لوں تا کہ اُن کی جان چھوٹے۔'' وہ کوشش کے باوجود ایک لفظ نہیں بول سکی۔

''پھر کیا خیال ہے..... کسی دن آ جاؤں؟'' اُسے اپنا آپ انتہائی ہلکا لگا۔ آنکھیں ایک پل میں جل تھل ہو کر برسنے لگی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا۔

''یقین کریں..... میں اتنا برا نہیں ہوں جتنا آپ نے سمجھ لیا ہے۔ معاشرے میں میرا ایک مقام ہے۔ میں آپ کو اچھی زندگی دے سکتا ہوں۔'' اُس نے اپنے آپ کو بولنے سے معذور

محسوس کیا تو ریسیور رکھ دیا۔ اور ابھی وہیں کھڑی تھی کہ دوبارہ بیل بجنے لگی۔ وہ یہی سمجھی اُسی کا ہوگا اس لیے وہاں سے ہٹ آئی۔ اور ابھی اپنے کمرے میں داخل ہو رہی تھی کہ پیچھے سے کرم دین بھاگتا ہوا آیا۔

''بی بی! صاحب کا فون ہے۔'' وہ انہی قدموں واپس پلٹ آئی۔ ریسیور اُٹھایا تو اپنی بے بسی پر اور شدت سے رونا آیا کیونکہ حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے جی کہہ سکی۔

''میں بہت دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن شاید فون بزی تھا۔'' اُن کا انداز جتانے والا تھا۔ وہ عجیب مشکل میں گرفتار ہوگئی۔

''کیا آپ سو رہی تھیں؟'' وہ اُس کے خاموش رہنے پر پوچھنے لگے۔

''نہیں۔''

''اچھا تو ایسا ہے کہ آج ایک دوست کے ہاں ڈنر میں جانا ہے۔ آپ تیار رہیے گا۔'' انہوں نے فون کرنے کا مقصد بتایا۔

''سوری!'' وہ منع کرنا چاہتی تھی اور اسی قدر کہہ سکی۔

''سوری.....؟'' انہوں نے دہرایا۔

''میرا مطلب ہے' میں نہیں جا سکوں گی۔''

''کیوں؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' وہ تشویش سے پوچھنے لگے اور اُس کے ذہن پر ابھی کچھ دیر پہلے کی باتیں دستک دینے لگیں۔

''ابتسام آپ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔''

''ہیلو بجی!'' وہ پکار رہے تھے اور وہ فون بند کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُس کی سمجھ

میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کبھی ابتسام کے رویے کو سوچتی اور کبھی اُس کی باتوں کو..... پتہ نہیں صداقت کہاں تھی۔

جتنے اطمینان اور ٹھوس لہجے میں وہ باتیں کر رہا تھا اس سے وہ اس کی باتوں کو نظر انداز بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ پھر اُس کے بعد ابتسام کے سابقہ رویے میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ اُلجھنے لگی۔

''انہوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اگر وہ مجھے چھوڑ دیں گے تو میں ندا کے بھائی سے سمجھوتا کر لوں گی۔ ہرگز نہیں! وہ کون ہوتے ہیں میرے بارے میں اپنا فیصلہ کرنے والے.....؟ میں خود سوچ سکتی ہوں۔'' اور پھر وہ ایک نئے انداز سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

''آپ نے میری طرف سے خلع کا جو دعویٰ دائر کیا ہے اس کا فیصلہ کب تک ہوگا؟'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں پوچھ رہی تھی کہ اُنہوں نے حیران ہو کر اُسے دیکھا۔ پھر بظاہر سرسری انداز میں بولے۔

''ایک آدھ مہینہ لگ جائے گا۔'' پھر اُسے سوچتے دیکھ کر پوچھے بغیر نہیں رہ سکے۔

''کیوں؟''

''اصل میں ندا کے بھائی کا فون آیا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ میں جتنے مرضی دعوے کر لوں' وہ اپنا حق ثابت کر کے رہے گا۔''

''اچھا!'' وہ خواہ مخواہ ہنسے۔ اور وہ کچھ دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس لیے پوچھنے لگی۔

''ندا کے بھائی کو یہاں کا نمبر آپ نے دیا ہے؟''

''نہیں'' وہ دل ہی دل میں محظوظ ہوئے۔

''لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ آپ ہی نے اُسے مجھ سے بات کرنے کے لیے کہا ہے تاکہ وہ

مجھے اپنے حق میں ہموار کر سکے اور یہ بھی کہ آپ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔''

''کیا؟'' انہوں نے حیرت کا مظاہرہ کیا اور وہ پروانہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''اگر ایسی بات ہے ابتسام احمد! تو آپ کو براہِ راست مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ اُس لوفر آدمی کو کیوں میرے پیچھے لگا دیا؟''

''میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ میری تو کبھی اُس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔'' اُس کے بدلے تیور دیکھ کر انہیں اپنی صفائی پیش کرنی پڑی۔

''ہو سکتا ہے آپ سچ کہہ رہے ہوں۔ پھر بھی اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔'' اس نے بڑے آرام سے اپنا فیصلہ سُنا دیا جبکہ وہ سٹپٹا گئے۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''میں صرف ابا جی کے ڈر سے کٹھ پتلی بنی رہی۔ حالانکہ مجھے اسی روز انہیں ساری بات بتا دینی چاہیے تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ وہ ڈانٹتے۔ اس کے بعد یہ صرف میرا مسئلہ تو نہ رہتا۔ ابا جی جو مناسب سمجھتے..... کرتے۔ اور اب میں نے یہی سوچا ہے کہ میں اماں اور ابا جی کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اِن حالات میں وہ میرا یہاں رہنا پسند نہیں کریں گے۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کریں۔'' اُن کا اُلجھنا فطری امر تھا۔ ''اب جبکہ حالات ٹھیک ہونے جا رہے ہیں تو آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔''

''مجھے حالات کسی طرح بھی ٹھیک ہوتے نظر نہیں آ رہے۔''

''آپ کو کیا پتہ؟''

''اب اتنی نادان بھی نہیں ہوں میں۔ بس آپ مجھے جانے دیں۔''

''میں پھر وہی کہوں گا کہ اگر یونہی کچھ دنوں کے لیے جانا چاہتی ہیں تو ضرور جائیں لیکن.....''

''نہیں میں یونہی نہیں جاؤں گی۔'' وہ فوراً بول پڑی۔

''پھر؟''

''میں نے طے کرلیا ہے کہ اب میرا مسئلہ ابا جی ہی حل کریں گے۔ اس کے بعد اپنے بارے میں فیصلہ میں خود کروں گی۔'' وہ حتمی انداز میں بولی تو وہ کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اصل میں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے اس کے ارادے سے کیسے باز رکھیں۔ پھر سوچ کر بولے۔

''سنجیدہ خانم! اب یہ صرف آپ کا مسئلہ نہیں رہا۔ آپ جو ابا جی سے بات کرنے کا کہہ رہی ہیں تو یہ بھی سوچا ہے کہ اس کے بعد میری پوزیشن کتنی آکورڈ ہو جائے گی!

کیا یہ سوال نہیں اُٹھے گا کہ میں نے کس حیثیت سے آپ کو اپنے گھر میں رکھا؟

آئی ایم سوری خاتون! میں ان باتوں کو برداشت نہیں کرسکوں گا۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' وہ زچ ہو کر بولی۔

''بس کچھ دن انتظار کریں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ خفگی بھرا انداز لیے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے تو وہ اس وقت کو کوسنے لگی جب ندا کی شادی میں گئی تھی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس دن کے بعد سے ابتسام کچھ اکھڑے اکھڑے سے رہنے لگے تھے۔ بات بھی ضرورت کے تحت کرتے' بلکہ جب تک گھر میں ہوتے' زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتے تھے۔ بس صبح ناشتے پر ہی باقاعدگی سے سامنا ہوا تھا۔ رات کا کھانا یا تو کھا کر آتے یا اگر جلدی بھی آجاتے تو منع کر دیتے تھے۔

یہ صورتِ حال اُسے اور پریشان کر رہی تھی کیونکہ اس گھر میں اپنا وجود بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ کسی کسی وقت اُس کا دل چاہتا وہ چُپ چاپ یہاں سے نکل کر کسی ایسی جگہ چلی جائے جہاں کبھی کوئی اس حد تک نہ پہنچ سکے۔ انہی پریشان سوچوں میں گھر کر وہ بھول ہی گئی کہ اماں کے گھر گئے ہوئے کتنے بہت سارے دن ہو گئے ہیں اور اُس روز اماں خود چلی آئیں۔ انہیں دیکھ کر اُسے

ے بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ بے اختیار اُن کے گلے لگ گئی۔

''تم تو راستہ ہی بھول گئی ہو۔'' اماں بیٹھتے ہی شکوہ کرنے لگیں۔

''نہیں اماں! پچھلے دنوں کچھ طبیعت خراب رہی اور آج کل ابتسام مصروف ہیں۔''

''ہاں! کچھ کمزور بھی لگ رہی ہو۔'' اماں نے بغور اُسے دیکھا۔ پھر رازداری سے نے لگیں۔ ''نئے مہمان کے آثار تو نہیں؟''

''نہیں۔'' وہ جھینپ گئی۔

''اللہ کی دین ہے۔ میں تو ہر وقت دُعا کرتی ہوں۔'' اماں اپنی کہے گئیں۔

''فہمی کو بھی لے آتیں۔'' اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔

''میں خود ہی نہیں لائی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ بولتی بہت ہے اور مجھے تم سے بات کرنی تھی۔''

''ایسی کیا بات ہے؟'' وہ اچنبھے سے پوچھنے لگی۔

''فہمی کے لیے ایک دو جگہ سے پیغام آئے ہیں۔ اسی سلسلے میں تمہارے ابا جی نے کہا تم بھی مشورہ کرلوں۔''

''کون لوگ ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ پھر اچانک خیال آیا تو اُٹھتے ہوئے بولی۔

''ٹھہریے! پہلے میں چائے کا کہہ آؤں۔ پھر بات کرتے ہیں۔''

''چائے رہنے دو۔'' اماں نے روکا لیکن وہ چلی گئی۔ پھر واپس آ کر اُن کے برابر بیٹھی تو نے لگی۔

''ہاں! اب بتایئے کون لوگ ہیں؟''

''ایک تو اپنے ہی رشتے داروں میں سے ہے تمہاری چھوٹی ممانی کا بھائی ہے۔ اور رے غیر ہیں۔'' اماں نے بتایا۔ پھر کہنے لگی۔

''رشتے تو دونوں اچھے ہیں لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' ان کے خاموش ہونے پر اُسے پوچھنا پڑا۔

''بس سفید پوش لوگ ہیں اور میں سوچتی ہوں لوگ کیا کہیں گے کہ ایک بیٹی کو تو اچھے خاصے گھر میں دیا اور دوسری کو.....''

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے اماں! لیکن یہ تو سب مقدر کے کھیل ہیں۔ سب کو ایک جیسا تو نہیں ملتا۔ اور یہ ضروری تو نہیں ہے کہ بڑے گھر میں آدمی ہنسی خوشی راج ہی کرے۔ مجھے دیکھیں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ سارا دن کوئی بات کرنے والا نہیں ہوتا۔''

''تو خوش تو ہے ناں!'' اماں کو فوراً فکر لاحق ہوئی۔

''خوش ہوں بھی اور نہیں بھی۔'' پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر یہی گھر بھرا پُرا ہوتا تو اچھا لگتا۔''

''اللہ تمہاری گود بھرے گا تو گھر بھی بھر دے گا۔''

وہ نہ ہاں کہہ سکی نہ ناں اور غنیمت کہ ملازم لوازمات کے ساتھ چائے لے کر آ گیا تو وہ اُدھر متوجہ ہو گئی۔

''یہ سموسے لیجئے اماں!'' اُس نے ٹیبل اماں کے سامنے کھینچ دی۔ پھر کہنے لگی۔

''بہرحال اگر آپ کا دل نہیں مانتا تو انتظار کریں۔ ہو سکتا ہے کوئی اور اچھا رشتہ مل جائے۔''

''لیکن تمہارے ابا جی اس بات کو نہیں مانتے۔ کہتے ہیں ضروری نہیں ہے فہمی کا نصیب بھی بجی جیسا ہو۔ اُن کا کہنا ہے لڑکا شریف ہو اور کھاتا کماتا ہو بس.....!''

''پھر اب میں کیا کہوں؟'' وہ ابا جی کی بات سے بھی اختلاف نہیں کر سکتی تھی۔

''تم ابتسام سے ذکر کر کے دیکھو۔ ہو سکتا ہے.....؟''

''میں خاص طور سے نہیں کہوں گی اماں!'' وہ اُن کی پوری بات سُنے بغیر بول پڑی۔

''بس یہ ذکر کر دوں گی کہ فہمی کے لیے رشتے آئے ہوئے ہیں۔ پھر دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔''

''ہاں! اگر اُس کی نظر میں کوئی ہو گا تو بتا ہی دے گا۔'' اماں خود ہی پر سوچ انداز میں بولیں۔ پھر خیال آیا تو پوچھنے لگیں۔

''تمہاری نند جو آنے والی تھی؟''

''ہاں! بیٹا ہوا ہے ناں اُس کا۔ میرا خیال ہے سوا مہینہ کر کے آئے گی۔ ویسے سوا مہینہ ہونے والا ہے۔ دیکھیں کب آتی ہے؟''

''چلو تمہارے گھر میں کچھ رونق ہو جائے گی۔''

''ہاں اماں! میں خود اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔'' وہ اشتیاق سے بولی۔

''اچھا! اب پھر میں چلوں۔''

''اتنی جلدی کیا ہے۔ شام میں ابتسام آئیں گے تو آپ کو چھوڑ آئیں گے۔''

''نا بیٹا! پھر تو بہت دیر ہو جائے گی۔ فہمی بھی گھر میں اکیلی ہے۔'' اماں اس کی بات سنتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اچھا کچھ دیر تو اور بیٹھیں!''

''بس اب تم آنا۔ فہمی بھی بہت کہہ رہی تھی اتنے دنوں سے تم نہیں آئی۔''

''آؤں گی۔''

وہ اُن کے ساتھ چلتی ہوئی باہر تک آئی۔ پھر چوکیدار سے کہہ کر اُن کے لیے رکشہ منگوایا اور اُن کے جانے کے بعد اندر آئی تو فطری طور پر فہمی کے بارے میں سوچنے لگی۔ ابھی ان سوچوں سے نکلی نہیں تھی کہ لاؤنج سے کچھ شور کی آواز آنے لگی۔ وہ پہلے چونکی، پھر سُننے کی کوشش کرنے لگی۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو کمرے سے نکل آئی۔ ابتسام چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے ندا کو دیکھ کر وہیں رُک گئی۔ اور کیونکہ فوری طور پر ذہن اس صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھا اس لیے اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

''بجی!'' اس پر نظر پڑتے ہی ندا خوشی سے بھرپور آواز میں چیخی اور بھاگ کر اس سے لپٹنا چاہتی تھی کہ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''ارے کیا تمہیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟'' ندا نے حیرت کا مظاہرہ کیا اور وہ بے چینی اور سنجیدگی سے بولی۔

''نہیں۔''

''کمال ہے میں تو تم سے ملنے کے لیے مری جا رہی تھی۔''

''کیوں؟'' وہ اب بھی انجان تھی۔

''اس لیے کہ تم میرے عزیز از جان بھائی جان کی منظورِ نظر ہو۔ میری بھابھی اور پتہ ہے.....؟''

''پلیز!'' اس نے ہاتھ اُٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ پھر ابتسام کی طرف اس انداز سے متوجہ ہوئی جیسے انہیں ندا سے متعارف کروانا چاہتی ہو لیکن انہیں بچے میں مصروف دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

پھر تصدیق کے لیے ندا کی طرف دیکھا تو وہ کندھے اُچکا کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''سوری! بھائی جان نے تمہیں تنگ کیا۔ حالانکہ ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔''

''تم!'' پھر اُن کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''آپ.....''

''جناب!'' وہ کھل کر مسکرائے۔ پھر بچے کو ندا کی گود میں دیتے ہوئے بولے۔

''یقین کریں، ہمارا مقصد آپ کو تنگ کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ میں تو اول روز ہی آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ.....''

وہ اُن کی پوری بات سُنے بغیر بھاگ کر کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ شاید وہ بُری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔

''ارے!'' وہ دونوں بہن بھائی اُس کے پیچھے لپکے۔ پھر کتنی دیر تک دروازے پر دستک دینے کے ساتھ اُسے پکارتے رہے لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا اور تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہی۔

دوپہر ڈھلی پھر شام..... وہ اسی طرح کمرے میں بند تھی۔ کبھی شدت سے رونے لگتی اور کسی وقت روتے روتے نیند آ جاتی۔ آنکھ کھلتی تو پہلے وحشت سے چاروں طرف دیکھنے لگتی۔ پھر تکیے میں منہ چھپا لیتی۔ اُسے بے حد دُکھ ہو رہا تھا۔ ساتھ میں دونوں بہن بھائی..... پر غصہ بھی تھا کہ وہ اس تمام عرصے میں کتنی پریشان رہی اور وہ دونوں خاص کر ابتسام اس کا تماشا دیکھتے رہے۔ بلکہ ٹیلی فون پر دوسرا روپ دھار کر ڈراتے بھی رہے تھے۔

''میں اب بالکل بھی یہاں نہیں رہوں گی۔'' سوچتے سوچتے وہ آخر میں یہ جملہ ضرور دہراتی۔ اس وقت بھی وہ یہی کہہ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اُس نے تکیے میں سے سر نکال کر دیکھنا چاہا لیکن کمرہ مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''سنجیدہ پلیز دروازہ کھولیں۔'' ابتسام کی آواز تھی۔ وہ دوبارہ تکیے میں سر دینا چاہتی تھی کہ وہ کہنے لگے۔

''اگر آپ نے اب بھی دروازہ نہ کھولا تو مجھے مجبوراً اسے توڑنا پڑے گا۔''

وہ بہت آہستگی سے اُٹھی اور لاک کھول کر دوبارہ مسہری پر آ بیٹھی۔ انہوں نے لاک کھولنے کی آواز سُن لی تھی۔ کچھ لمحے انتظار کیا۔ پھر خود ہی اندر آ گئے۔ اندھیرے کے باعث وہ فوراً نظر نہیں آئی۔ تب اُنہوں نے لائٹ جلا کر دیکھا، وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی۔ شدت گریہ سے آنکھیں سُرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ انہیں بے حد افسوس ہوا۔ قریب آتے ہوئے بولے۔

''تمہاری خفگی بجا..... لیکن ہماری بھی تو سُنو۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔

''میں جانتا ہوں اس تمام عرصے میں تم بہت پریشان رہی ہو۔ اور بخدا میں پہلے ہی مرحلے پر تمہاری پریشانی دور کرنا چاہتا تھا لیکن تمہارے منہ سے اپنے لیے نفرت انگیز کلمات سُن

کر میں نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ویسے اس میں تھوڑی سی میری خود غرضی کا بھی دخل ہے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میرے سامنے بھی نفرت کا اظہار کرو۔ اس لیے میں نے اپنا آپ عیاں نہیں کیا۔''

قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

''اور تھوڑا قصور تمہارا بھی ہے کیونکہ تم نے کبھی میری بات سہولت سے سُننے کی کوشش ہی نہیں۔ بس تمہاری ایک ہی ضد تھی مجھے طلاق دو۔ اور یہ میرے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن بات تھی۔ اس لیے کہ نکاح کے بندھن میں بندھتے ہی تم میرے لیے جان سے بڑھ کر ہو گئی تھیں۔''

وہ جو انتہائی ناگواری سے اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔ آخری بات پر دل تو زور سے دھڑکا ہی' آنکھیں بھی چھلک پڑی تھیں۔

''پلیز روؤمت! میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا۔ فیصلے کا اختیار اب بھی تمہیں ہے۔''

''کیسا فیصلہ؟'' وہ براہِ راست اُن کی آنکھوں میں دیکھ کر تیکھے لہجے میں بولی۔

''بھئی اگر تم مجھے مجرم سمجھتی ہو تب بھی مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا حق تو تھا اور میں نے کہہ دیا۔ اب تمہاری مرضی..... معاف کر دو یا سزا دو۔''

وہ ابھی تک اُن پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اپنی بات کے اختتام پر اُنہوں نے سر اس کے سامنے جھکا دیا تو وہ گردن موڑتے ہوئے بولی۔

''آپ بہت خراب ہیں۔''

''شکریہ۔''

وہ سر اونچا کرتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ اور اُس کا چہرہ اپنی طرف موڑنا چاہتے تھے کہ ندا کی آواز پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ وہ دروازے میں سے جھانک کر پوچھ رہی تھی۔

''بھائی! کیا صورتِ حال ہے؟''

''جل تھل کے بعد کا سماں ہے۔ قوسِ قزح کے رنگ دیکھنا چاہو تو آ جاؤ۔''

اُن کی آواز کی شوخی نے سچ مچ اُس کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ بکھیر دیے تھے' وہ تو دلچسپی سے دیکھ ہی رہے تھے' ندا بھی بھاگی چلی آئی۔

☆☆☆

یہ بہاروں کی شام

سردیوں میں شام بہت جلدی ڈھل جاتی ہے ادھر مغرب کی نماز پڑھ کر بیٹھو کہ کچھ ہی دیر میں عشاء کی اذان ہونے لگتی ہے اور اس کے بعد تو لگتا ہے جیسے بہت رات بیت گئی ہو۔ کئی دنوں سے وہ سوچ رہی تھی اپنا ادھ سلا سوٹ مکمل کر لے اور آج صبح تو اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ یہ کام ضرور کر گزرے گی۔ لیکن چھوٹا سا دن گزرتے پتا بھی نہیں چلا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے صرف جھاڑ پونچھ ہی کی تھی کہ پتا چلا امی دوپہر کے کھانے کی فکر کر رہی ہیں اور اسے یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ امی کچن میں سر کھپاتی رہیں۔

وہ اپنا کام چھوڑ کر ان کے ساتھ کچن میں لگ گئی۔ دوپہر میں کچھ دیر کے لئے سونا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا کھانا کھاتے ہی لیٹ گئی۔ گو کہ بار بار یہ جملہ دہراتی رہی تھی کہ بس ابھی اٹھ جاتی ہوں لیکن جب ساتھ والے بیڈ پر اسماء کو بے خبری کی نیند سوتے دیکھا تو اس کا دل بھی بے ایمان ہو گیا۔

''کوئی اتنی زیادہ سلائی تو باقی نہیں ہے۔ سو کر اٹھوں گی تو مکمل کر لوں گی۔'' اپنے آپ

کو اس طرح بہلاتے ہوئے کمبل میں منہ چھپا لیا تھا۔

پھر اسماء نے ہی اسے اٹھا کر چائے کا کپ تھمانے کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی تھی کہ اس کی ساس اور نندیں آئی ہوئی ہیں۔

''ہونے والی۔'' اس نے اسماء کو گھورتے ہوئے تصحیح کی تھی۔ پھر شام کا وقت اس طرح گزر گیا اور اب عشاء کی نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ اسماء کے ساتھ لحاف میں دبک گئی۔ ابو جی آج صبح ہی آفس کے کسی کام سے لاہور چلے گئے تھے۔ شوبی اور نومی ابھی ٹیوشن سنٹر سے نہیں لوٹے تھے۔ رات کا کھانا ان کے آنے پر ہی کھایا جاتا تھا۔

''زارا۔'' اسماء اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''مجھے لگتا ہے' تمہارے سسرال والے شادی کی کوئی قریبی تاریخ رکھنا چاہتے ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''میں جب چائے دینے گئی تھی تو تمہاری ساس' میرا مطلب ہے ہونے والی ساس کچھ اسی قسم کی گفتگو کر رہی تھیں اور ان کی بیٹیاں بھی خاصی پرجوش دکھائی دے رہی تھیں۔''

''امی نے کیا کہا؟''

''ظاہر ہے' امی نے ساری بات ابو جی کے آنے پر ٹال دی۔ ویسے بھی ابو جی تین چار روز میں آ ہی جائیں گے۔''

''ہوں۔'' وہ ہوں کہہ کر جانے کس سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟'' اسماء نے پوچھا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''بتاؤ ناں۔ خوشی کی بات تو ہے کہ اب اس گھر میں شادیانے بجیں گے۔''

''ہاں لیکن پتا نہیں کیوں اسماء! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''کیوں؟''

''شاید اس لئے کہ بالکل انجانے لوگ ہیں۔ پتا نہیں ان کا ماحول کیسا ہو اور میں

ایڈجسٹ بھی کر سکوں گی کہ نہیں۔'' وہ خاصی فکرمند نظر آ رہی تھی۔

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔''

اسماء گو کہ اس سے چھوٹی تھی پھر بھی اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

''شروع میں تھوڑی دقت ضرور ہوتی ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ویسے آذر بھائی بہت اچھے مزاج کے ہیں۔ میرا خیال ہے تم بہت جلد ان کے ماحول میں ایڈجسٹ ہو جاؤ گی۔''

''کیا ان کے گھر کا ماحول بھی ہمارے گھر جیسا ہے؟''

''پتا نہیں۔'' اسماء نے کندھے اچکائے پھر کہنے لگی۔

''میرا خیال ہے اتنا دقیانوسی نہیں ہو گا جیسا کہ ہمارا ہے۔''

''ہمارا دقیانوسی تو نہیں ہے۔'' وہ فوراً بول پڑی۔

''تو اور کیا ہے۔ بے چارے آذر بھائی میری خوشامد کر کر کے تھک گئے ہیں کہ تمہاری ایک جھلک انہیں دکھا دوں۔ جھلک نہیں تو تصویر ہی لیکن امی نے اتنی سختی سے منع کر رکھا ہے کہ میری ہمت ہی نہیں ہوئی اور ابو جی بھی اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔''

''تو اس سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ ہم دقیانوسی ہیں۔''

''کیوں آج کل تو منگنی کے بعد لڑکی اور لڑکا علی الاعلان ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ شادی کی شاپنگ بھی دونوں مل کر ہی کرتے ہیں۔''

''کرتے ہوں گے لیکن.....'' اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ شوبی ان کے کمرے میں جھانک کر پوچھنے لگا۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ نہیں'' اسماء نے کہا تو وہ اندر آتے ہوئے بولا۔

''خیر تو ہے۔ یہ آج تم دونوں نے اتنی جلدی بستر کیوں سنبھال لیا؟''

''سردی کی وجہ سے۔''

''ہاں سردی تو ہے۔'' وہ دونوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑتا ہوا اسماء کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''کمبل اوڑھ لو۔''

''نہیں' میرا خیال ہے' پہلے کھان کھالیا جائے۔''

''ارے ہاں' میں گرم کرتی ہوں۔'' اسماء اٹھی ہی تھی کہ نومی بڑے پرجوش انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔

''ابھی ابھی بڑا زبردست پروگرام ذہن میں آیا ہے۔'' وہ آتے ہی بولا اور پھر تینوں کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگا۔

''ابو تو لاہور گئے ہوئے ہیں۔ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔''

''کیا مطلب۔''

''بھئی وی سی آر۔ اور دو تین فلمیں کرائے پر لے آتا ہوں۔''

''زبردست آئیڈیا لیکن امی منع کردیں گی۔''

''امی کو منا لیتے ہیں۔ تم اسماء' جلدی سے کھانا گرم کرو۔ کھاتے ہی لے آؤں گا۔''

''پہلے امی کو راضی کرو۔'' وہ جاتے جاتے بولی۔

''امی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے تھوڑی سرزنش کریں گی' پھر مان جائیں گی۔''

نومی ہنستے ہوئے بولا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ امی نے پہلے منع کیا۔ تھوڑا ڈانٹا بھی' پھر ان کی خواہش کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ کھانے کے دوران انہوں نے فلموں کے نام تجویز کیے۔ پھر جب نومی اور شوبی وی سی آر لینے چلے گئے تو وہ دونوں لحاف اور کمبل لے کر ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ انہوں نے امی سے بھی کہا کہ وہ بھی ادھر ہی آجائیں لیکن امی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی انہیں کچھ ہدایات دے کر سونے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

''میرا خیال ہے چائے بنا کر تھرماس میں رکھ لیتی ہوں ورنہ نومی بار بار فلم دیکھتے میں

سے اٹھائے گا۔''

اسماء کو یاد آیا تو فوراً کچن کی طرف چلی گئی۔ پھر جب وہ چائے سے بھرا تھرماس اور مگ لے کر آئی تو نومی اور شوبی وی سی آر سیٹ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایسا موقع انہیں کبھی کبھی ہی ملتا تھا کیونکہ ابو جی وی سی آر کے سخت خلاف تھے۔ خاص طور پر انڈین فلمیں تو بالکل بھی نہیں دیکھنے دیتے تھے۔ ان چاروں کو بھی کوئی اتنا زیادہ شوق تو نہیں تھا بس کبھی کبھار دل چاہتا تھا کہ گھر بیٹھے کوئی ایسی تفریح جس میں آزادی سے انجوائے کیا جا سکے۔ اور فلم دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس پر جو وہ چاروں تبصرہ کیا کرتے تھے۔ اس سے وہ خاصا حظ اٹھایا کرتے تھے۔

''دیکھو۔ تین سال کا بچہ ہے۔ اسے جوان ہونے تک یاد رہے گا کہ اس مقام پر ولن نے میرے ماں باپ کو مارا تھا۔''

''ایمان سے کیا زبردست یادداشت ہوتی ہے فلم والوں کی۔ مجھے تو آج کی بات یاد نہیں رہتی۔''

''چپ کرو ناں۔''

اسماء نے ٹوکا۔ اسے فلم میں کچھ دلچسپی نظر آنے لگی تھی۔ سب کو ٹی وی کی طرف متوجہ کیا۔ کچھ اس قسم کا سین تھا کہ لڑکی کے جہیز میں کچھ چیزوں کی کمی۔ لڑکے والوں کا پہلے مطالبہ پھر بارات واپس لے جانے کی دھمکی۔ اس کے بعد دھمکی پر عمل بھی کر ڈالا۔ بارات واپس جا رہی تھی لڑکی کی ماں تو اسی وقت تیورا کر گر گئی اور باپ چوکھٹ سے سر ٹکرا رہا تھا۔

''کیا بکواس دکھا رہے ہیں۔'' زارا اکتا کر بولی۔

''ایسا بھی کہیں ہوتا ہے بھلا۔ بارات ہی تو واپس جا رہی ہے۔ کوئی سچ مچ قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑی۔ اب دیکھو اچھا بھلا آدمی چوکھٹ سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے گا۔ حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔''

''زارا چپ کرو ناں۔'' اسماء نے پھر ٹوکا۔

''بھئی میں چپ نہیں رہ سکتی۔ مجھے تو بجائے افسوس ہونے کے ہنسی آ رہی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ ہنسی کے درمیان تبصرہ بھی جاری تھا۔

''سر ٹکرانے کی بجائے شکر ادا کرنا چاہئے کہ اسی وقت لڑکے والوں کی قلعی کھل گئی۔ اور لڑکی دیکھو۔ یوں بیٹھی ہے جیسے غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں۔''

''تو کیا تم اسے معمولی بات سمجھ رہی ہو؟'' شوبی نے گردن موڑ کر سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

''معمولی نہیں ہے تو ایسا بھی نہیں ہے کہ سارا خاندان ہی فوت ہو جائے سوائے ہیروئن کے۔''

''یہ صدمہ بڑا گہرا ہوتا ہے زارا۔ تم اگر سنجیدگی سے سوچو تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں نہیں مانتی۔ بس بند کرواسے' کوئی اچھی سی دوسری فلم لگاؤ۔''

''ہوں اچھی سی فلم۔ اس فلم پر تم ہنس رہی ہو اور کامیڈی فلم پر یقیناً روؤ گی۔''

''اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ جس طرح کی کامیڈی ہوتی ہے۔ اس پر ہنسنے کی بجائے رونا آتا ہے۔ اور ٹریجڈی پر رونے کی بجائے ہنسی۔''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن پلیز' اب جبکہ ہم پیسے خرچ کر ہی چکے ہیں تو جیسی بری بھلی فلمیں ہیں دیکھ لینے دو۔''

نومی کی بات پر وہ واقعی سنجیدہ ہو گئی۔ پھر پوری رات انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ کبھی خاموشی سے دیکھتے اور کبھی بہت ساری فلم ان کے تبصرے میں گزر جاتی۔

صبح جب امی نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو چاروں سوئے ہوئے نظر آئے۔ نومی صوفے پر اور شوبی دیوان پر نظر آیا اور وہ دونوں نیچے سو رہی تھیں۔

''زارا' اسماء!'' امی نے ان کے منہ پر سے لحاف اٹھا کر آواز دی۔

''سونا ہی ہے تو اپنے کمرے میں جا کر سوؤ۔''

''اچھا امی!'' اسماء دوبارہ لحاف منہ پر ڈالنا چاہتی تھی کہ امی نے پورا لحاف کھینچ لیا۔

''کوئی مہمان آ گیا تو کتنی پریشانی ہو گی۔ چلو اٹھو یہاں سے۔''

''صبح صبح کوئی نہیں آتا۔''

''بہر حال تم یہاں نہیں سوؤ گی۔''

امی نے زبردستی دونوں کو اٹھا کر ان کے کمرے میں بھیج دیا پھر شوبی اور نومی کو اٹھانے لگیں۔

☆☆☆

اسماء کا اندازہ درست نکلا۔ ابو جی جیسے ہی لاہور سے آئے۔ اس سے اگلے دن زارا کے سسرال والے شادی کی تاریخ لینے آ گئے۔ ابو جی اس کی شادی کرنا تو چاہتے تھے لیکن کوئی قریبی تاریخ دینے سے قاصر تھے۔ کیونکہ ابھی چھ ماہ پہلے ہی اس کی منگنی ہوئی تھی اور اس دوران وہ پوری تیاری بھی نہیں کر سکے تھے۔

ابو جی گورنمنٹ ملازم تھے اور عام لوگوں کا خیال تھا کہ جس کرسی پر وہ بیٹھے ہیں' وہاں اضافی آمدنی تنخواہ سے چار گنا زیادہ ہوتی ہے۔ لوگوں کا خیال غلط بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اکثر لوگ اضافی آمدنی کو جائز سمجھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے ہیں لیکن ابو جی حقیقتاً ایسے نہیں تھے۔ محنت اور حق حلال کی کمائی پر زندگی گزاری۔ اور بچوں کو بھی یہی درس دیتے تھے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنے اصولوں کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ اپنا ذاتی گھر تک تو تھا نہیں ان کے پاس جبکہ ان سے جونیئر کئی کئی پلاٹ بک کروا کے بیٹھے تھے۔

بہر حال زارا کی شادی کے لئے وہ اس کے سسرال والوں کو مزید چھ ماہ رکنے کے لئے کہہ رہے تھے لیکن ان لوگوں کو پتا نہیں کس بات کی جلدی تھی۔ ایک مہینے سے زیادہ بڑھنے کو تیار ہی نہیں ہوئے۔ اتنا اصرار کیا کہ مجبوراً ابو جی کو ہامی بھرنی پڑی۔

یوں تاریخ طے ہوتے ہی گھر میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کیونکہ اس گھر میں پہلی

شادی تھی اس لئے امی خاصی بوکھلائی ہوئی تھیں۔ کپڑوں اور کراکری کی طرف سے انہیں کچھ اطمینان تھا کیونکہ یہ دونوں چیزیں شاید انہوں نے بیٹیوں کی پیدائش کے ساتھ ہی جمع کرنی شروع کردی تھیں۔ لیکن جہیز میں دینے کے لئے یہی دو چیزیں تو کافی نہیں ہوتیں۔ اس لئے بقیہ سامان کے لئے خاصا تردد کرنا پڑ رہا تھا۔

ابو جی اپنی ایک عمر کی جمع پونجی اس شادی پر خرچ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسماء' زارا سے صرف ایک سال چھوٹی ہے۔ اس لئے اس کے لئے بھی کچھ بچا کر رکھنا چاہئے۔ ان کی بات غلط بھی نہیں تھی لیکن امی بھی کیا کرتیں کہ کوئی نہ کوئی خرچ نکلا چلا آ رہا تھا۔ خرچ میں صرف دولہا کے کپڑوں کا حساب رکھا گیا تھا جبکہ بعد میں اس کے تمام گھر والوں کے لئے بھی کپڑے بنانے پڑے۔ اسی طرح ہر خرچ میں سے کوئی دوسرا خرچ نکلتا چلا گیا۔

وقت کو بھی جیسے پر لگ گئے تھے۔ اتنی جلدی دن گزرے کہ پتا بھی نہیں چلا۔ صرف پانچ دن رہ گئے تھے۔

اس وقت وہ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کی کزنز جنہیں آج ہی امی نے بلایا تھا کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر اسماء کے ساتھ ڈرائنگ روم میں چلی گئیں جہاں ان سب نے ڈھولک سنبھال لی تھی۔

چھ ماہ پہلے وہ آذر کے ساتھ منسوب کی گئی تھی اور کیونکہ اس کے گھر کا ماحول بہت روایتی قسم کا تھا۔ اس لئے آذر کے نام کی انگوٹھی پہنتے ہی وہ اپنا سب کچھ اسے ہی سمجھ بیٹھی تھی۔ حالانکہ اس نے آذر کو دیکھا تک نہیں تھا۔ بس سارا کمال اس انگوٹھی کا تھا جس نے انگلی کو گرفت میں لیتے ہی اس کی ساری سوچوں کو بھی گرفت میں لے لیا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے وہ ایک ان دیکھے شخص کو نہ صرف سوچ رہی تھی بلکہ اس کے حوالے سے کچھ خواب بھی سجا لئے تھے۔

اسماء' شوبی اور نومی سب ہی آذر کی بہت تعریف کرتے تھے اور ان کی تعریفوں سے ہی اس نے اپنے ذہن میں آذر کا خاکہ بنا لیا تھا۔ اس وقت جبکہ ڈرائنگ روم سے ڈھولک' تالیوں اور

گانے کی آواز آ رہی تھی تو وہ ٹھوڑی گھٹنوں پر لگائے کسی اور ہی دنیا میں نکل گئی تھی۔

''زارا۔'' اسماء نے دروازے سے جھانک کر اسے پکارا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''آذر بھائی کی والدہ اور بہنیں آئی ہیں۔ تم آجاؤ تو ذرا جلدی سے چائے وغیرہ بنا لیں گے۔''

وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور شال اپنے گرد اچھی طرح لپیٹتی ہوئی اسماء کے ساتھ کچن میں آ گئی۔ اسماء نے جلدی سے چولہا جلا کر چائے کا پانی رکھا اور وہ ٹرے میں کپ رکھنے لگی۔

''اس وقت کیسے آئے یہ لوگ؟'' وہ دھیمی آواز میں پوچھنے لگی۔

''پتا نہیں۔'' اسماء نے لاعلمی کا اظہار کیا ساتھ ہی بسکٹ کا پیکٹ اسکے ہاتھ میں تھما دیا جسے کھول کر وہ بسکٹ پلیٹ میں رکھنے لگی۔

''میرا خیال ہے مہمانوں کی تعداد وغیرہ کے بارے میں کوئی مشورہ کرنا ہوگا۔''

اسماء قیاس کرتے ہوئے بولی۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا خاموشی سے ٹی پاٹ ٹرے میں رکھ کر اسماء کو جانے کا اشارہ کیا۔

''شکریہ زارا۔'' اسماء نے کہا اور ٹرے اٹھا کر چلی گئی۔

وہ فوراً اپنے کمرے میں نہیں گئی۔ چولہا جلا کر یونہی اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ کمرے کے مقابلے میں کچن گرم تھا۔ اس لئے یہاں کھڑے ہونا اچھا لگ رہا تھا۔

کافی دیر بعد اسے خیال آیا کہ اگر کوئی اچانک ادھر آ جائے تو اسے اس طرح کھڑے دیکھ کر پتا نہیں کیا سوچے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے چولہا بند کیا اور کچن سے نکل آئی۔

ابو جی کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگی تو اندر سے آذر کی والدہ کے بولنے کی آواز آئی۔ ڈرائنگ روم میں لڑکیوں کی وجہ سے شاید وہ لوگ یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دبے

پاؤں یہاں سے گزرنا چاہتی تھی اور ابھی پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ ٹھٹھک کر رُک گئی۔ آذر کی والدہ غالباً ابو جی کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھیں۔

''بھائی صاحب! آپ کے لئے کیا مشکل ہے۔ سرکاری ملازم ہیں۔ ذرا سے اشارے پر ایک کیا دس ٹی وی آ جائیں گے۔ آپ دس نہ لیں ایک ٹی وی لے لیں۔ اور پھر ہم کوا سا اپنے لیے مانگ رہے ہیں۔ اپنی بیٹی کو ہی دیں گے، وہی دیکھے گی۔''

''میرے خدا!'' اس نے بہت آہستگی سے اپنا پورا وجود دیوار کے ساتھ لگا لیا۔ اور ا جی کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن ابو جی اور امی میں سے کسی کی آواز نہیں آئی۔ دوبارہ آذر والدہ کی آواز آئی۔

''الیکٹرانک کے سامان میں آپ کیا دے رہے ہیں؟ صرف ایک ٹیپ اور ٹیپ بھ آج کل بغیر ڈیک کے کوئی سننا پسند نہیں کرتا۔ نہ فریج نہ واشنگ مشین، نہ ٹی وی اور نہ وی سی آر جب اب تو ایک عام سا آدمی بھی یہ ساری چیزیں بڑے آرام سے جہیز میں دیتا ہے۔ اور آپ تو ماشاءا اچھے خاصے عہدے پر ہیں۔''

''میں نے کبھی اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔'' ابو جی کی آواز کا رعب جا کہاں کھو گیا تھا۔

''میری جتنی حیثیت ہے، میں نے اسی کے مطابق بیٹی کو جہیز دیا ہے۔ ہاں اگر اس بڑھ کر کر سکتا تو ضرور کرتا آپ کو کہنے کی ضرورت کبھی پیش نہ آتی۔''

''لیکن بھائی صاحب! اس معمولی سے سامان کے ساتھ ہم آپ کی بیٹی کیسے بیاہ لے جائیں۔ اپنی برادری میں ہم کیسے یہ معمولی سا سامان دکھائیں گے؟''

''کوئی ضروری نہیں ہے۔ آپ برادری میں نہ دکھائیں۔'' امی کی دھیمی آواز آئی۔

''واہ! یہ کیسے ممکن ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ ہم نے آذر کا رشتہ ایک سرکاری اف کے گھر کیا ہے۔''

''پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟'' ابو جی ہار مان گئے۔

''چلیے۔ ہم وی سی آر چھوڑ دیتے ہیں لیکن باقی سارا سامان تو آپ کو دینا پڑے گا۔''

وی سی آر چھوڑنے کا احسان کیا گیا۔

''فریج۔ ٹی وی۔ واشنگ مشین۔ یہ ساری چیزیں دینا تو بہت مشکل ہے۔''

''مشکل ہے۔ ناممکن تو نہیں۔''

''مجھے تو ناممکن ہی لگ رہا ہے۔''

''اگر ناممکن ہے تو ہماری طرف سے بات ختم سمجھیں۔'' آذر کی والدہ شاید اپنے زعم میں کھڑی ہو گئی تھیں۔ اور امی کا منت بھرا لہجہ اس کی رگوں میں منجمد ہوتے لہو میں جیسے ایک دم سے آگ لگا گیا۔ امی انہیں روک رہی تھیں۔ بیٹھنے کا اصرار کر رہی تھیں۔

''امی۔ ابو جی۔'' اس کا دل چاہا وہیں سے چیخنا شروع کر دے اور کہے۔

''مت روکیں انہیں۔ جانے دیں'' لیکن بدستور زبان بند رکھی کہ وہ بولنے کا حق رکھتی تھی پھر بھی محروم تھی۔ بے دردی سے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبایا۔ دل میں اٹھتے طوفان کو دبانے کی کوشش میں پورے وجود میں درد کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ اور آنکھوں میں اچانک اتر آنے والا یلاب تو روکے نہ رکا۔ بمشکل تمام اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور اپنے کمرے کی طرف اتے ہوئے اس نے ابو جی کو کہتے سنا۔

''ٹھیک ہے خاتون! سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق ہو جائے گا۔''

''ابو جی نے کیوں مان لیا۔''

انتہائی دکھ سے سوچتے ہوئے وہ لحاف میں جا چھپی۔ آنکھوں کا پانی پہلے ہی پلکوں سے ملک چکا تھا اور اب تو روانی سے بہنے لگا۔ کچھ وقت پہلے وہ اسی جگہ بیٹھی خوبصورت خواب سجا رہی ا اور اب ان کے ریزوں کی چبھن آنکھوں میں بلکہ روح تک میں جا اتری تھی۔ دل چاہ رہا تھا چیخ کر روئے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی اس لئے تکیے میں سر دے کر سسکتی رہی۔

ذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا ورنہ بہت کچھ سوچ ڈالتی۔ ڈرائنگ روم سے ا
ڈھولک کی آواز آرہی تھی اور گانا کم ہنسنے کی آواز زیادہ تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جس کے لئے یہ
اہتمام کیا گیا ہے اس پر کیا بیت گئی۔ اس کے آنسو کسی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے
پھر اپنی حرماں نصیبی پر آنسو بہاتے بہاتے وہ سوگئی۔

صبح اس کی آنکھ قدرے دیر سے کھلی۔ کچھ دیر تک بالکل خالی الذہن سی چھت کو گھ
رہی پھر اچانک گھر میں غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا تو فوراً گردن گھما کر اسماء کے بیڈ کی ط
دیکھا۔ اس کا بیڈ خالی دیکھ کر خیال آیا کہ رات وہ کزنز کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ہی سوگئی ہو
اس کے ساتھ ہی بہت ساری باتیں یاد آگئیں تو وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ اور رات
تک رونے کی وجہ سے آنکھیں بھی بوجھل سی لگیں۔ جب منہ دھونے کھڑی ہوئی تو آئینے میں
آپ کو دیکھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرا اترا ہوا۔ تولیے سے منہ صاف کر کے کمرے
آئی پھر کمرے سے شوبی کی آواز آرہی تھی۔ اس نے سوچا وہ بھی ادھر چلی جائے' لیکن پھر یہ
کر کہ شاید ابو جی بھی موجود ہوں ادھر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے کچن میں آگئی۔

اپنے لئے چائے بنا کر وہیں کھڑے کھڑے پی اور جب واپس اپنے کمرے کی ط
جا رہی تھی تو پھر امی کے کمرے کے سامنے رک گئی۔ نومی اور شوبی پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ وہ
اسی طرف آگئی۔ اسے دیکھ کر دونوں بھائی ایک دم خاموش ہو گئے۔

''اٹھ گئیں بیٹا۔'' امی کی آواز کا بوجھل پن اسے تڑپا گیا۔ اور وہ ضبط کرتی ہوئی ا
پاس جا بیٹھی۔

''ناشتا بناؤں تمہارے لئے؟'' امی اٹھنے لگیں تو اس نے روک دیا۔

''میں چائے پی کر آرہی ہوں اور ابھی ناشتے کی خواہش نہیں ہے۔''

''چائے کس نے بنائی تھی؟''

''میں نے خود۔''

''تم کیوں گئیں کچن میں؟ مجھ سے کہا ہوتا۔'' امی نے کہا تو اس نے ان کا ہاتھ اپنے
دونوں ہاتھوں میں دبا لیا اور بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم دونوں اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو مجھے۔ کیا میں بدلی ہوئی نظر آرہی ہوں؟''

''تم کیا بدلو گی۔'' نومی نے ہلکے پھلکے انداز میں اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی' جبکہ وہ
اسی طرح سنجیدگی سے بولی۔

''انسان کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے اور میں بھی انسان ہی ہوں۔ خیر چھوڑو' کیا بات کر
رہے تھے؟''

''کوئی خاص بات نہیں۔ بس ایسے ہی امی کے پاس آبیٹھے تھے۔''

''اچھا۔'' وہ افسردگی سے مسکرائی اور امی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں جانتی ہوں تم دونوں یونہی ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے والے نہیں ہو اور میں یہ بھی جانتی
ہوں کہ میرے آنے سے پہلے یہاں کون سا مسئلہ زیر بحث تھا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ نومی اور شوبی کی سوالیہ نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے امی کی
طرف دیکھنے لگی۔ اور ان کے نظریں چرانے پر بولی۔

''معاف کیجئے گا امی! یہ ہے تو غیر اخلاقی حرکت' لیکن مجھ سے سرزد ہو گئی ہے۔ رات
یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے آذر کی والدہ کی ساری باتیں سن لی تھیں۔''

''بیٹا! شادی بیاہ کے معاملوں میں ایسی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔''

''نہیں امی!'' وہ فوراً بول پڑی۔

''یہ باتیں پہلے طے کر لی جاتی ہیں نا کہ ایسے وقت جب دوسرا بے بس ہو اور لڑ
والوں کی بات ماننے پر مجبور ہو جائے۔''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''میں تو یہی کہوں گی کہ آذر کے گھر والے شاید اسی انتظار میں تھے کہ ہمارے شادی

کارڈز سب کے گھروں میں پہنچ جائیں تو وہ اپنی ڈیمانڈز لے آئیں تاکہ ہم انکار کرنا بھی چاہیں نہ کر سکیں۔"

"میں بھی یہی بات کہہ رہا تھا۔" نومی نے کہا تو وہ لمحہ بھر کو اس کی طرف متوجہ ہوئی کہنے لگی۔

"آپ ہی بتایئے اگر وہ لوگ اپنی فرمائشیں زیادہ نہیں صرف ایک ہفتہ پہلے۔ آتے تو کیا ابو جی مان لیتے۔ کبھی نہیں۔ بلکہ اسی وقت یہ رشتہ ختم کر دیتے۔"

"بیٹا! تم یہ سب باتیں مت سوچو۔"

"کیسے نہ سوچوں۔ میں تو کہتی ہوں، ابھی بھی وقت ہے صاف منع کر دیں۔"

"نہیں زارا!" شوبی چھوٹا ہونے کے باوجود اسے سمجھانے لگا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ اپنے پرائے سب جانتے ہیں کہ چار دن بعد تمھاری بارات والی ہے۔ اب اگر بات ختم کر دی گئی تو لڑکے والوں کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ لوگ ہمیں ہی بنائیں گے۔"

"شوبی ٹھیک کہہ رہا ہے۔" امی نے تائید کی۔

"اور پھر تمھیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمھارے ابو جی نے ان کی بات ہے تو انشاء اللہ ان کی ڈیمانڈز بھی پوری کر دیں گے۔"

اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ امی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بیٹا! اولاد کی خوشیوں کی خاطر والدین کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔"

"آپ سمجھتی ہیں۔ میں خوش رہوں گی۔ نہیں امی یہ مادی چیزیں میری خوشیوں کی ضامن کبھی نہیں ہو سکتیں۔"

"زارا پلیز۔ اس طرح کی باتیں مت کرو۔" نومی نے ٹوک دیا پھر امی سے کہنے لگی۔

"آپ ابو جی سے کہیں، اسماء کی فکر چھوڑیں۔ ابھی جو کچھ ہے زارا پر خرچ کریں

اللہ جب اسماء کی باری آئے گی تو ہم دونوں بھائی کسی قابل ہو چکے ہوں گے اور اس وقت ابو جی کو زیادہ تردد بھی نہیں کرنا پڑے گا۔"

"میں نے بھی یہی کہا ہے ان سے۔ اب دیکھو وہ کیا کرتے ہیں۔ خیر اب تم لوگ اس بات کو یہیں ختم کرو۔ کسی اور تک کوئی بات نہیں پہنچنی چاہئے اور زارا تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں لڑکیوں کو اٹھاتی ہوں۔"

امی بیڈ سے اتریں تو وہ بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

اپنے کمرے میں آئی تو دل چاہا۔ ایک ایک چیز کو اٹھا اٹھا کر پٹخنا شروع کر دے۔ دل میں آگ سی لگی تھی جو کسی پل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ کاش وہ کسی طرح آذر ملک تک رسائی حاصل کر سکے اور اس سے پوچھے کہ تم کیسے مرد ہو جو اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کرنے کی بجائے دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ اس کے دل کا بوجھ سوا ہو گیا اور آنکھوں کی نمی پلکوں تک اتر آئی تھی اسی وقت اسماء اور بینا کی آواز آئی۔ وہ شاید اٹھ کر ادھر ہی آ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اپنے بیڈ پر چلی گئی اور منہ لحاف کے اندر کر لیا۔

"زارا! سو رہی ہو کیا؟" اسماء نے اس کا لحاف ہلا کر پوچھا تو بینا اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

"سونے دو۔ یہی چار دن ہیں سکون سے سو لے پھر ایسی بے خبری کی نیند کہاں نصیب ہو گی بھلا۔"

"ہاں!" اسماء اس کے ساتھ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی اور وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے سے نہ روک سکی۔

پھر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر لڑکیاں گھر کی صفائی ستھرائی میں لگ گئیں۔ اس کے بعد کچھ نے کچن سنبھالا اور کچھ اس کے جوڑے ٹانکنے بیٹھ گئیں۔ کئی بار اسماء اسے بلانے آئی کہ وہ بھی ان کے پاس آ بیٹھے۔ لیکن اس نے سہولت سے منع کر دیا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

دل پر بوجھ تو تھا ہی اب اچانک ایک انجانا سا دھڑکا بھی لگ گیا تھا۔ پتا نہیں کیا ہو یا کیا ہونے وا
ہے۔ اس خیال سے دل سہما جا رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا اس نے سب کے اصرار اور بے حد مجبور کر
پر ان سب کے ساتھ بیٹھ کر کھایا بلکہ زہر مار کیا۔ اس کے بعد دوبارہ اپنے کمرے کی طرف آ رہی تھی
کہ ابو جی کو آتے ہوئے دیکھا وہ اس وقت تو کبھی نہیں آتے تھے۔ اسے اچنبھا ہوا اور وہیں رک کر
انہیں دیکھنے لگی۔ وہ بے حد تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ چہرے پر تفکرات کی لکیروں کا جال یقیناً
رات والی باتوں سے بنا تھا۔ اسے کھڑے دیکھ کر وہ رک گئے اور وہ فوراً آگے بڑھ کر پوچھنے لگی۔

''ابو جی! آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''ہاں بیٹا! میں ٹھیک ہوں بلکہ سب ٹھیک ہے۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا او
اپنے کمرے میں چلے گئے۔ لمحہ بھر کو اسے اپنے سر پر بے حد مضبوط سائبان کا احساس ہوا اور پھر فو
ہی ایسے لگا جیسے سر ننگا ہو گیا ہو۔ پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی اور سر پر سے چھت۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے گھبرا کر آس پاس دیکھا۔ دیواریں ہل رہی تھیں لیکن
نہیں' زلزلوں کی زد میں وہ خود تھی۔ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر زور زور سے جھٹکے دیے اور پھ
یوں لگا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اسے ابو جی کے کمرے میں دھکیل رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ ان کے
بیڈ کے پاس کھڑی دیکھ رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے چپ چاپ لیٹے تھے۔

''ابو جی!'' بہت آہستہ آواز میں پکارا۔ جواب نہ ملا۔

''ابو جی!'' قدرے اونچی آواز پھر اور اونچی۔

اس کے بعد پکار چیخ میں بدل گئی۔ ابو جی موجود ہوتے تو سنتے۔ وہ تو شاید اس کی
خوشیاں خریدنے کسی اور جہاں میں نکل گئے تھے۔

''میں ٹھیک ہوں ہلکہ سب ٹھیک ہے۔'' ابھی چند لمحے پہلے تو انہوں نے کہا تھا او
انہوں نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر سب ٹھیک ہو جانے کا اشارہ دیا تھا۔

اس کی چیخوں سے پورا گھر دہل گیا تھا۔ سب بھاگے چلے آئے۔ امی سمجھیں وہ رات

کی باتوں سے کچھ زیادہ ہی دل برداشتہ ہو گئی ہے اور ابو جی کے سامنے حوصلہ ہار کر یوں رونے لگی
ہے۔ اسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''اس طرح کیوں رو رہی ہو؟'' وہ جواب دینے کی بجائے امی کے کندھے پر سر رکھ کر
چیخنے لگی۔ نومی نے ابو جی کو یوں چپ چاپ لیٹے دیکھا تو الٹے پیروں باہر بھاگا۔ کچھ دیر بعد ہی
ڈاکٹر کے ساتھ واپس آیا۔ ڈاکٹر نے سب کو ایک طرف ہٹایا اور جھک کر ابو جی کو دیکھنے لگا۔

''ہارٹ فیل۔'' ڈاکٹر سیدھا کھڑا ہوا تو اس کے ہونٹوں سے نکلے اس لفظ نے کمرے
میں چھائے سکوت کو درہم برہم کر دیا۔

وہ شخص جو زندگی بھر اپنے اصولوں میں بہت سخت رہا تھا۔ آج بیٹی کی خاطر شاید کچھ نرمی
پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن دل نے ساتھ ہی نہیں دیا۔ پہلے یقیناً مچلا ہو گا پھر ٹھہر گیا یوں کہ اس گھر کے در
و دیوار سے ٹکراتی چیخیں بھی اس میں حرکت پیدا نہ کر سکیں۔

عزیز رشتے دار چار دن بعد ویسے بھی اس گھر میں آنے والے تھے اس گھر کی سب سے
پہلی خوشی میں شریک ہونے لیکن ابو جی نے پہلے ہی سب کو بلا لیا۔ زارا کی ڈولی کو کندھا بعد میں دینا
پہلے مجھے کندھا دو۔

''یہ اچانک کیا ہو گیا؟''

''کل تک تو ٹھیک ٹھاک تھے۔''

آنے والے اسی قسم کے جملے بول رہے تھے۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کو
دیکھتی رہی۔ اس کی چیخیں اچانک تھم گئی تھیں۔ ہونٹ ایک دوسرے میں مدغم ہلکے ہلکے لرز رہے
تھے۔ اس کے پاس ساری باتوں کا جواب تھا۔ ہر اک کو بتا سکتی تھی کہ ابو جی کو اچانک کیا ہو گیا اور وہ
بتانا بھی چاہتی تھی لیکن آواز اندر ہی کہیں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ بس اس وقت وہ ایک جھٹکے سے کھڑی
ہوئی جب آذر کی والدہ کو آتے دیکھا۔ ساری توانائیاں صرف کر کے وہ اسی قدر کہہ سکی۔

''مار ڈالا۔ میرے ابو جی کو مار ڈالا۔''

پھر اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ گرنے سے پہلے اس نے دیکھا۔ نومی اور شوبی اس
کی طرف بڑھ رہے تھے پھر کچھ یاد نہیں رہا۔

☆☆☆

زندگی میں اچانک اس طرح تبدیلی آجائے گی۔ کبھی کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ابو جی
کے جانے سے گھر کے در و دیوار تک میں ویرانیاں سمٹ آئی تھیں۔

ابو جی اس طرح کبھی نہ جاتے۔ وہ اس دن سے اب تک یہی بات سوچ رہی تھی۔

''اگر ایک عورت بیٹے کی ماں ہونے کا زعم لئے نہ آتی۔ یہ صحیح ہے کہ موت کا ایک وقت
معین ہے لیکن آذر کے گھر والے کبھی بھی بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ وہ سب کے سامنے انہیں الزام
دینا چاہتی تھی لیکن امی نے اپنی قسم دے کر اس کی زبان بند کر دی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ کہہ دینے سے
دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور جو کچھ ہوا وہ اسے خدا کی رضا جان لیتی۔ لیکن اب امی کی قسم سے مجبور ہو کر
ساری باتیں اندر ہی اندر ذخیرہ کرتے ہوئے وہ پاگل ہونے لگی تھی۔ ابو جی گھر کے سربراہ' واحد
کمانے والے تھے۔ بہن بھائیوں میں وہ سب سے بڑی تھی۔ گزشتہ سال اس نے بی اے کیا تھا
اس کے بعد اسماء بی اے فائنل میں تھی۔ پھر نومی اور شوبی دونوں انجینئرنگ کے دوسرے سال میں
تھے۔ اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں بہت سارے سال چاہئیں تھے۔

اولین دنوں میں جب لوگ شادی کے بارے میں کہتے تو اس کا دل چاہتا کہنے والے کا
منہ نوچ لے۔ اس وقت وہ کوئی دوسری بات سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں تھی لیکن جب وقت نے
بہت غیر محسوس طریقے سے دل پر صبر کا مرہم رکھ دیا تو بہت ساری باتیں اور مسائل اس کے سامنے
آگئے۔

گھر میں سب سے بڑی ہونے کے ناتے اس نے سب سے پہلے اور زیادہ محسوس کیا
اور یہ بھی جان گئی کہ گھر کی ناؤ جس بھنور میں پھنسی ہے وہاں سے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے نہیں نکال
سکتا۔ وہ باحوصلہ نہیں تھی بلکہ گھر کے روایتی ماحول نے اسے خود اعتمادی تک نہیں بخشی تھی۔ اب تک

کی زندگی پہلے گھر سے اسکول اور پھر کالج تک محدود رہی تھی اس کے علاوہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے وہ
نہیں جانتی تھی۔

سیدھی سادی زندگی میں یہ جو اچانک سانحہ رونما ہو گیا تھا اس سے وہ خاصی بوکھلا گئی
تھی۔ پھر بھی اس نے سوچا میرے ساتھ جو ہونا ہے وہ ہو گیا اب اس پر کڑھنے کی بجائے اسے گھر
کی فکر کرنی چاہئے اور ابھی وہ امی کو حوصلہ دے ہی رہی تھی کہ تایا جی اور چچا جی آگئے۔ امی سے کہنے
لگے۔

''بھائی کی بے وقت موت نے جو خلا پیدا کر دیا ہے وہ یقیناً زندگی بھر پر نہیں ہو سکے
گا۔ شاید خدا کی یہی مرضی تھی۔ ہم بے اختیار بندے بھلا کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن مرنے والے کے
ساتھ دنیا کے کام ختم نہیں ہو جاتے۔ نہ ہی رکتے ہیں۔ فوری طور پر نہ سہی لیکن بہر حال زندگی
معمول پر آ ہی جاتی ہے۔

یہ سانحہ زارا کی شادی کے دنوں میں ہی رونما ہوا تو ظاہر ہے مقررہ تاریخ پر اس کی
شادی نہ ہو سکی۔ بہر حال آج نہیں تو کل اس فرض سے سبکدوش تو ہونا ہی ہے تو پھر کیوں نہ کوئی
نزدیکی تاریخ لے کر اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔''

اس تمام عرصے میں امی نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا۔ اب جو جیٹھ اور دیور یتیم بھتیجی
کے سر پر ہاتھ رکھ رہے تھے تو امی کہنے لگیں۔

''آپ سب کے ہوتے ہوئے مجھے واقعی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے' میں تو یہ سوچ
رہی ہوں کہ ابھی آپ کے بھائی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہو گا۔'' امی کی آواز بھرا گئی تھی۔

''آپ غلط نہیں کہہ رہیں۔'' تایا جی کہنے لگے۔

''لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ زارا کی شادی آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ اور فرائض کی
ادائیگی جتنی جلدی ہو جائے' اچھا ہے۔''

''ہاں بھابھی!'' چچا جی نے تائید کی۔

''رشتے کا مسئلہ تو ہے نہیں' جو ہم سوچیں کہ جب اچھا رشتہ ملے گا۔تب کریں گے۔ بات طے ہے بس تاریخ لے لیں۔''

''امی کی سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دیں۔اصل میں ان کا دل آمادہ نہیں تھا۔کاش اللہ میاں زارا کے ابو جی کو کچھ مہلت عطا کرتے تو آخری وقت وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتے۔پتا نہیں انہوں نے کیا سوچا تھا۔ساری باتیں دل میں ہی لئے چلے گئے۔اور اب وہ شش و پنج میں تھیں کہ کیا کریں۔بے بسی سے تایا جی اور چچا جی کی طرف دیکھا۔وہ ان کے جواب کے منتظر تھے۔

''آپ کو کیا بات پریشان کر رہی ہے؟'' تایا جی بڑے تھے۔امی کو الجھن میں محسوس کر کے پوچھنے لگے اور ابھی امی کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ زارا اندر آ گئی۔وہ یونہی نہیں آئی تھی۔ابھی اسماء نے اسے بتایا تھا کہ یہاں اس کی شادی کا پروگرام بن رہا ہے۔وہ فوراً اپنی منگنی کی انگوٹھی لے کر آ گئی اور میز پر رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''تایا جی! میں شادی نہیں کروں گی۔میرا مطلب ہے آذر کے ساتھ۔''

''کیوں بیٹا؟'' تایا جی کا انداز اور لہجہ ابو جی جیسا ہی تھا۔

''زارا!'' امی نے ٹوکا اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

''ارے ارے۔'' چچا جی نے اٹھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔پھر اسی طرح اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولے۔

''بیٹا! روؤ مت۔مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟''

''کوئی بات نہیں ہے۔'' امی نے ٹالنا چاہا۔لیکن اس نے روتے ہوئے ساری صورتِ حال کہہ سنائی آخر میں کہنے لگی۔

''چچا جی! میں اپنے دل سے یہ بات کبھی نہیں نکال سکوں گی کہ ان لوگوں کی باتوں کی وجہ سے ابو جی کی جان گئی۔اور آپ ہی بتائیں ایسی صورت میں' میں وہاں خوش رہ سکوں گی؟ خوش

رہنا تو دور کی بات میں اس گھر میں جانا بھی نہیں چاہتی۔اور مجھے یقین ہے امی بھی ایسا نہیں چاہتی ہوں گی۔''

وہ پھر رونے لگی۔تو تایا جی اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

''بیٹا! تم نے صحیح فیصلہ کیا ہے!'' پھر امی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''آپ نے یہ ساری باتیں ہمیں کیوں نہیں بتائیں؟''

''کیا بتاتی۔میری تو اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔''

''بس اس رشتے کو ختم کر دیں۔زارا واقعی وہاں کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔'' تایا جی نے فیصلہ سنا دیا۔پھر اس سے کہنے لگے۔

''بیٹا! جاؤ منہ دھو لو۔اور سنو۔اب تم نے رونا نہیں ہے۔اپنی امی کی حالت دیکھ رہی ہو۔انہیں تم نے سنبھالنا ہے۔اور چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی۔''

''جی!'' وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے کو تھی کہ تایا جی اسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔

''ایک بات سنتی جاؤ۔جیسا کہ تم جانتی ہو کہ یہ گھر سرکاری ہے اور کچھ دنوں میں اسے خالی کرنے کا نوٹس آ جائے گا۔تو ایسی صورتِ حال میں تم سب میرے گھر شفٹ ہو جانا۔بلکہ میں تو چاہتا ہوں نوٹس آنے سے پہلے ہی.....''

''تایا جی! مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن.....''

''لیکن کیا؟''

''میں سمجھتی ہوں اگر ہم ابھی آپ کے گھر آئے تو آئندہ زندگی میں آزمائشوں کا سامنا کبھی نہیں کر سکیں گے' اس لیے آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم خود اس آزمائش سے نکلنے کی کوشش کریں۔''

''جیتی رہو بیٹا! خوش رہو۔بیٹیوں کو ایسے ہی بہادر ہونا چاہئے۔لیکن اپنے آپ کو تنہا

مت سمجھنا۔ کبھی کوئی مشکل گھڑی یا کوئی ضرورت ہو تو بلا جھجک میرے پاس آنا۔''

''آپ ہی کے پاس آؤں گی۔'' وہ جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ ہلکا سا مسکرائی اور پھر ان سے اجازت لے کر کمرے سے نکل آئی۔

رات میں وہ یونہی اپنا ذہن ہٹانے کی غرض سے ایک میگزین لے کر بیٹھی ہی تھی کہ اسماء کے پاس آ کر بہت رازداری سے کہنے لگی۔

''سنو! آذر بھائی کا فون آیا ہے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ بے حد خاموش نظروں سے اسماء کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے کسی سے بات نہیں کرنی۔''

''آذر بھائی کسی نہیں ہیں۔''

''وہ کسی ہی ہے۔ اور کہہ دو اس سے کہ آئندہ ہمارے گھر کا نمبر ڈائل کرنے کی کوشش نہ کرے۔''

''زارا؟'' ہر بات سے لاعلمی کی بنا پر اسماء کی حیرت بجا تھی۔

''میں نے جو کہا ہے، وہی کرو۔'' زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے بڑے ہونے کا رعب جمایا اور اسماء اسے اس قدر سنجیدہ دیکھ کر اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آ کر کہنے لگی۔

''مجھے آذر بھائی سے جھوٹ بولنا پڑا ہے کہ تم امی کے پاس بیٹھی ہو۔''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے منع کر دو کہ آئندہ یہاں رنگ نہ کرے۔''

''زارا!'' اسماء اس کے پاس آ بیٹھی۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ آذر بھائی اس گھر کے.....''

''اسماء۔'' اس نے ٹوک دیا۔

''جب تم کوئی بات نہیں جانتیں تو خواہ مخواہ بحث کیوں کرتی ہو؟''

''کیا نہیں جانتی میں؟''

''یہی کہ ہم اس رشتے کو ختم کر رہے ہیں۔'' اسماء کچھ دیر تک غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر الجھ کر پوچھنے لگی۔

''لیکن کیوں؟ کس نے کیا ہے یہ فیصلہ؟''

''یہ ہم سب کا فیصلہ ہے۔'' پھر اسماء کو ساری تفصیل بتاتے ہوئے وہ رو پڑی۔ اسماء بے حد حیران تھی اور شاید اسے یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔ جبھی پوچھنے لگی۔

''کیا واقعی اس دن آذر بھائی کی والدہ اور بہنیں ڈیمانڈز لے کر آئی تھیں؟''

''تو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''نہیں! تم غلط کیوں کہو گی لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' وہ آنکھیں صاف کر کے سوالیہ نظروں سے اسماء کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں حیران ہو رہی ہوں کہ کیا آذر بھائی بھی ایسے ہو سکتے ہیں؟'' پھر کچھ سوچتے ہوئے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔

''نہیں زارا! میرا دل نہیں مانتا۔ آذر بھائی یقیناً اس ساری بات سے بے خبر ہوں گے۔''

''ناممکن!'' وہ فوراً بول پڑی۔

''آذر اپنے گھر میں سب سے بڑے ہیں۔ سر پر باپ بھی نہیں ہے۔ اس لئے یقیناً ان کے گھر کا ہر کام اور ہر بات ان کے مشورے ہی سے ہوتی ہو گی۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ اس کے باوجود میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس معاملے میں انہیں بے خبر رکھا گیا ہو گا۔''

''تم آذر کے بارے میں اتنے یقین سے کیسے بات کر رہی ہو؟'' وہ ناگواری سے بولی۔

''اس لئے کہ میں گزشتہ چھ ماہ میں بارہا ان سے ملی ہوں۔ اور وہ مجھے کسی پہلو سے بھی

ایسے نہیں لگے۔ اور اگر تمھیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو ابھی فون کر کے خود آذر بھائی سے با
کرلو۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے ان سے بات کرنے کی۔ اور انہوں نے کون سا اعترا
کر لینا ہے۔ ظاہر ہے صاف مکر جائیں گے۔" اسماء نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ا
نے ٹوک دیا۔

"بس اب تم اس معاملے میں کچھ نہیں بولو گی اور ان کی طرفداری کرنے کی کوش
بھی مت کرنا۔ وہ میرے ابو جی کے قاتل ہیں اور میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"اور کان کھول کر سن لو اسماء! اگر تم نے اپنے طور پر آذر سے اس بات کی تصدیق
تردید کرانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

اسماء نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتی ر
پھر اٹھنے کو تھی کہ امی آ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں سوچ اور چہرے پر تفکرات کی لکیروں کا جال
زیادہ نمایاں ہو رہا تھا۔ اس نے بہت خاموشی سے ان کا جائزہ لیا۔ پھر اپنے پاس جگہ بناتے ہو
بولی۔

"آیئے امی! بیٹھیں۔" امی بیٹھ گئیں اور باری باری دونوں کو دیکھنے لگیں۔

"کیا بات ہے۔ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟" وہ ان کا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگی۔ پ
خود ہی قیاس کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے لگتا ہے۔ آپ کو کوئی بات پریشان کر رہی ہے۔ ہے نا؟" امی پر سوچ اندا
میں اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

"کیا بات ہے؟ ہمیں بتائیں۔"

"بیٹا!" امی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگیں۔

"تم نے اچانک جو آذر سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ تو میں اس وجہ سے پریشان ہو رہی ہوں۔ مجھے تمھارے فیصلے سے اختلاف نہیں ہے۔ اور شاید اتفاق بھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" امی کو الجھن میں محسوس کر کے وہ بھی الجھتے ہوئے بولی۔

"بیٹا! تم نے تو بہت سہولت سے کہہ دیا کہ آذر سے شادی نہیں کرو گی۔ اور تمھارے تایا جی اور چچا جی نے بھی تمھاری بات سے اتفاق کر لیا لیکن بیٹا ذرا آگے کی بھی تو سوچو۔"

"کیا سوچوں؟"

"یہی کہ تمام عزیزوں اور رشتہ داروں میں کارڈز تقسیم ہو چکے ہیں۔ لوگ تو جانتے ہیں کہ شادی ملتوی ہوئی۔ لیکن نسبت ٹوٹ جانے کی ہم کیا وجہ بتائیں گے۔ کیا ہر ایک کے سامنے ان کی اصلیت بے نقاب کرنا کچھ عجیب سا نہیں ہے۔ اور پھر کتنے لوگ ہماری بات کا یقین کریں گے۔"

"ہمیں کسی کا یقین حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بیٹا! تم ابھی نادان ہو، جبکہ میں بیٹی کی ماں بن کر سوچ رہی ہوں۔"

"بیٹی کی ماں ہونا کوئی جرم ہے کیا؟"

"شاید۔ آج کے اس دور میں سب سے بڑا جرم یہی ہے۔ تم نہیں جانتیں بیٹا کہ بیٹیوں والے قصوروار کبھی بھی نہیں ہوتے۔ لیکن ہمیشہ قصوروار ٹھہرائے جاتے ہیں۔"

"امی غلط نہیں کہہ رہیں۔" اسماء گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہنے لگی۔

"اور پھر ہو سکتا ہے آذر بھائی کی والدہ اور بہنیں اپنی اس حرکت پر نادم ہوں۔"

"ان کے نادم ہونے سے ابو جی واپس آ جائیں گے کیا؟" وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی لگاتے ہوئے بہت دکھ سے بولی۔

"بیٹا! اس طرح مت سوچو۔ خدائی کاموں میں کسی کا دخل نہیں ہوتا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ میرا دل کسی طرح سے بھی انہیں بری

الذمہ قرار دینے پر آمادہ نہیں۔آپ یقین کریں امی! جب آذر کی والدہ پر نظر پڑتی ہے تو پہلا خیال یہی آتا ہے کہ یہ میرے ابو جی کی قاتل ہیں۔آپ ہی بتائیں اس خیال کے ساتھ کیا میں ایک عمر ان کے ساتھ رہ سکوں گی۔''

امی خاموشی سے اس کی طرف دیکھے گئیں۔پھر کہنے لگیں۔

''یہ خیال تو مجھے بھی آتا ہے۔لیکن کیا کروں کہ اب جب کہ سر پر سائبان نہیں رہا تو میں اپنے اندر لوگوں کی باتیں سننے کا حوصلہ نہیں پاتی۔''

''پھر آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

''میں چاہتی ہوں۔ابھی تم کوئی فیصلہ مت کرو یا اگر فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہر ایک کو اس سے آگاہ مت کرو۔''

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر اٹھا کر امی کی طرف دیکھنے لگی۔

''میرا مطلب ہے اگر فوراً سب کو معلوم ہو گیا کہ تم وہاں شادی نہیں کرنا چاہتیں۔تو سب یہی کہیں گے کہ بات کے مرتے ہی بیٹی نے من مانی شروع کر دی۔اور بیٹا! تم لوگوں پر کوئی بات آئے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔میں بہت کمزور عورت ہوں۔پھر سائبان چھن جانے سے تو میں بالکل ٹوٹ چکی ہوں۔''

امی کی آواز بھرا گئی تھی اور ساتھ ہی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔وہ اور اسماء جو محض امی کی وجہ سے بڑے ضبط سے بیٹھی تھیں' ان کے آنسو چھلکتے دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکیں۔دونوں نے ایک ساتھ ان کی گود میں سر رکھتے ہی پلکوں پر بندھے حفاظتی بند ہٹا دیے۔

کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ اس طرح امی کے سامنے حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔فوراً سر اٹھا کر سیدھی ہو بیٹھی۔چادر سے آنکھیں اور چہرہ صاف کیا پھر امی کے گرد بازوؤں کا گھیرا ڈالتے ہوئے بولی۔

''پلیز امی! آپ نہ روئیں۔اور جس بات کو آپ نے اتنا بڑا مسئلہ سمجھ لیا ہے۔وہ کوئی

ایسا مسئلہ نہیں ہے۔میرا خیال ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔اور جہاں تک آذر سے شادی کا سوال ہے تو اگر آپ کہیں گی تو میں اس سے شادی بھی کر لوں گی۔لیکن ابھی نہیں۔ابھی ہمیں اور بہت کچھ کرنا ہے۔''

''بیٹا!'' امی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''میں تمہیں اس شادی پر مجبور نہیں کر رہی اور نہ کروں گی۔بس میں چاہتی ہوں ہم جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ہر کام ہر بات وقت پر اور سہولت سے ہو' تاکہ تم لوگوں پر کوئی آنچ نہ آئے۔''

''جیسے آپ کہیں گی' ویسے ہی ہوگا۔''

اس نے اپنی ہتھیلیوں سے امی کے آنسو صاف کیے۔پھر اسماء کو آنسو صاف کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے فوراً موضوع بدل کر نومی اور شوبی کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔

پھر اگلے دو تین مہینے دوسرے مسائل کو حل کرنے میں گزر گئے۔یعنی ابو جی کے پراویڈنیٹ فنڈ اور انشورنس سے جو پیسہ ملا اس سے ایک فلیٹ لے کر وہاں شفٹ ہو گئے۔اس دوران وہ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کی کلاسیں بھی لیتی رہی تھی۔نومی اور شوبی کا خیال تھا کہ وہ پڑھائی چھوڑ کر کوئی کام وغیرہ تلاش کریں گے۔لیکن اس نے سختی سے منع کر دیا۔وہ خود جاب تلاش کر رہی تھی۔یوں گھر کی ناؤ کسی کنارے لگانے کے چکر یا جدوجہد میں وقتی طور پر اس کا مسئلہ آپ ہی آپ پس منظر میں چلا گیا تھا۔

دوسرے اس دوران آذر کے گھر سے کوئی آیا بھی نہیں تھا۔پتا نہیں وہ لوگ شرمسار تھے یا اب انہیں اس گھر سے اپنی مطلوبہ چیزیں جہیز میں ملنے کی امید نہیں رہی تھی جو انہوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔بہر حال فلیٹ میں شفٹ ہونے کے بعد امی نے چاہا کہ گھر بدلنے کی اطلاع ان لوگوں تک پہنچا دی جائے۔لیکن اس نے منع کر دیا۔اس کا کہنا تھا کہ اگر ان لوگوں کو غرض ہوگی کسی سے پوچھ کر بھی آ سکتے ہیں۔دوسری صورت میں وہ یہ سمجھیں گے کہ ہم ان کے منتظر بیٹھے ہیں۔

یہاں نومی اور شوبی اور اسماء نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ جبھی امی کو خاموش ہونا پڑا۔

☆☆☆

آذر سے اس کی ملاقات اچانک یا اتفاقیہ نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ پلاننگ کے بعد کچھ مراحل سے گزرتے ہوئے اس تک پہنچی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس نے کسی کو آگاہ نہیں کیا تھا بڑی تگ ودو کے بعد اس فرم میں جاب حاصل کر پائی تھی جہاں آذر جنرل منیجر کی کرسی پر براج تھا۔ اس کا آفس میں تیسرا دن تھا۔ جب آذر نے آتے ہی اسے اپنے کمرے میں بلوا بھیجا۔ گز دو روز سے اس نے بس دور ہی سے اسے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور خیال تھا کہ بہت اعتماد اس کا سامنا کر سکے گی۔ لیکن اب اس کی کمرے کی طرف جاتے ہوئے لگا۔ جیسے وہ کچھ خو ہے۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو حوصلہ دیتے ہوئے اس کے سامنے کھڑی ہوئی، تب بھی نرو رہی تھی۔

''زارا عمر'' کسی فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے بس لمحہ بھر کو سر اٹھا کر اس کی ط دیکھا۔ پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

''جی۔'' وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔

''پلیز۔'' بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر فائل بند کر کے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو جب وہ بیٹھ گئی تو پوچھنے لگا۔

''کیسا لگا آپ کو آفس اور ساتھ کام کرنے والے لوگ؟''

''سب اچھے ہیں۔'' وہ سر جھکا کر آہستہ آواز میں بولی۔

''کوئی شکایت یا پرابلم؟''

''نو سر۔''

''گڈ۔'' ریوالونگ چیئر کی بیک سے سر ٹکا کر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھنے

''اس سے پہلے بھی کہیں جاب کی ہے آپ نے؟''

''نو سر، یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔''

''جبھی آپ کچھ خوفزدہ سی نظر آ رہی ہیں۔'' اس کے سر اٹھا کر دیکھنے پر کہنے لگا۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی کوئی پرابلم ہو تو بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔ ویسے یہاں کام کرنے والے سب لوگ بہت اچھے اور تعاون کرنے والے ہیں۔ امید ہے آپ کچھ دنوں میں سیٹ ہو جائیں گی۔''

''جی۔'' وہ اس کے نرم اور شائستہ لہجے پر اندر ہی اندر خاصی الجھن محسوس کر رہی تھی۔

''ایک بات آپ کو بتا دوں۔''

وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔

''ہمارے ایم ڈی ذرا سخت مزاج کے آدمی ہیں۔ کام سے لاپروائی اور ڈسپلن کی خلاف ورزی کسی طرح برداشت نہیں کرتے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار اچانک اس آفس کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ اس لئے آپ ذرا خیال رکھیے گا کہ انہیں شکایت کا موقع نہ ملے۔''

''جی!''

''او کے۔'' وہ اسے جانے کا اشارہ کرتے کرتے رک گیا۔

''معاف کیجئے گا مس عمر میں آپ سے چائے کا پوچھنا تو بھول ہی گیا۔''

''نو سر، تھینک یو۔'' وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ چائے پیتی نہیں ہیں یا......!''

''اس وقت نہیں۔'' وہ اس کی بات پوری کر کے کمرے سے نکل آئی۔

''کس قدر دوغلا شخص ہے۔'' اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے سوچا۔

''اپنی شخصیت پر مصنوعی خول چڑھا کر سمجھتا ہے اندر کے عیب چھپا لے گا۔ ویسے بڑا بصورت خول چڑھایا ہے۔ میں اگر اس کی حقیقت نہ جانتی تو یقیناً دھوکہ کھا جاتی۔'' اس کے اندر ھیر ساری تلخی اتر رہی تھی۔ اور نفرت کا احساس دھیرے دھیرے غالب آ رہا تھا۔

رات میں جب اسماء کچن کے آخری کام نمٹا کر سونے کی غرض سے کمرے میں آئی تو
چھت پر نظریں مرکوز کیے جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ اسماء کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھ
رہی پھر بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے بیڈ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ پھر بھی متوجہ نہ
ہوئی۔

''زارا!'' اسماء نے پکارا تو وہ یونہی نظروں کا زاویہ بدل کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے؟ اس طرح کیوں لیٹی ہو؟''

''کس طرح؟''

''یوں چپ چاپ!''

''کوئی بات نہیں' آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' اس نے کنارے سے کھسک کر اسماء کے
جگہ بنائی۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

''امی سو گئیں کیا؟'' وہ تکیہ سیدھا کر کے ذرا سی اونچی ہو گئی۔

''ہاں! اور اب تم جلدی سے بتاؤ۔ کیا خاص بات بتانے والی ہو؟'' اسماء نے کہا
چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمھیں کیسے پتا کہ کوئی بات ہے۔''

''تمھارا انداز بتا رہا ہے۔''

''اچھا۔'' وہ ہنسی پھر ایکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

''پتا ہے اسماء میں نے اس شخص تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ جس کی تعریف
زمین آسمان کے قلابے ملایا کرتی تھی۔

''کیا مطلب' میں کس کی تعریف کیا کرتی تھی؟'' اسماء بالکل نہیں سمجھی۔

''بھول گئیں آذر کو۔''

''ارے! تمھاری آذر بھائی سے ملاقات ہوئی ہے؟'' اسماء اس کے لہجے پر غور کیے

اشتیاق سے پوچھنے لگی

''ہاں۔'' وہ اسی طرح سنجیدہ تھی۔

''اور اب یہ ملاقات روز ہوا کرے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم دونوں ایک ہی جگہ جاب کر رہے ہیں۔''

پھر اس نے اسماء کو تفصیل سے بتایا کہ اسے یہاں جاب کرنے میں کتنی دشواریوں کا
سامنا کرنا پڑا اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔

''کیا مقصد ہے تمھارا اور تم کیا چاہتی ہو؟'' اس کی ساری بات سن کر اسماء پوچھنے لگی۔

''میں ابو جی کے قاتل کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اور آج جب اسے قریب
سے دیکھا تو وہ اپنی مکروہ شخصیت پر شائستگی کا خول چڑھائے نظر آیا۔'' قدرے توقف کے بعد وہ
کہنے لگی۔

''وہ زیادہ دن تک اس خول کے سہارے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا میں بہت جلد
اسے بے نقاب کر دوں گی۔''

''زارا! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اور یہ اچانک تمھیں کیا سوجھی؟''

''اچانک نہیں اسماء! میرے اندر تو اسی روز انتقام کی آگ جل اٹھی تھی۔ جس روز ابو جی
ان کی بے جا خواہشات کے آگے زندگی ہار گئے تھے۔ اور یقین کرو، اس تمام عرصے میں، میں ایک
پل کے لئے بھی اس احساس سے نہیں نکلی۔ وہ میرے باپ کا قاتل ہے۔ میں اسے کبھی معاف
نہیں کروں گی۔''

''زارا!'' اسماء اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر کہنے لگی۔

''تم یہ مت سمجھنا کہ میں آذر بھائی کی وکالت کر رہی ہوں۔ انہوں نے اپنی شخصیت پر
کوئی خول نہیں چڑھا رکھا۔ وہ شروع سے ہی ایسے ہیں۔ گفتار میں نرمی اور لہجے میں شائستگی، یہ ان

کی شخصیت کا خاصا ہیں۔ میرا یقین نہیں تو امی سے پوچھو۔ نومی اور شوبی سے پوچھو۔ ہم یونہی تو نہیں ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔''

''ظاہر ہے۔ اس گھر سے اسے بہت کچھ لینا تھا تو وہ ایک عام سا مرد بن کر تو نہیں آ سکتا تھا۔ آخر اسے سب کو مرعوب تو کرنا ہی تھا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔''

اسماء جان گئی تھی کہ اگر اس نے آذر کے حق میں مزید کوئی بات کی تو وہ فوراً کہہ دے گی کہ کیا وہ تمھیں ابو جی سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لئے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن اس کا دل کسی طرح بھی آذر بھائی کے بارے میں اس انداز سے سوچنے پر آمادہ نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ شادی سے صرف چار دن پہلے ان کی والدہ اور بہنیں جو بھاری جہیز کی ڈیمانڈ کرنے آ گئی تھیں۔ اس سے آذر بھائی بے خبر ہوں گے۔ اگر انہیں ذرا سا بھی اپنی والدہ کے ارادے کی خبر ہو جاتی تو وہ کبھی بھی انہیں ایسا نہ کرنے دیتے۔ زارا کا یقین اس کے برعکس تھا۔ اور وہ کسی طرح بھی اپنے یقین کو جھٹلانے پر تیار نہیں تھی۔

''سنو زارا! آذر بھائی نے تمھیں پہچانا کہ نہیں؟'' اسماء کو خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

''نہیں، اور میرا خیال ہے جب تک میں اپنا تفصیلی تعارف نہ کروالوں وہ نہیں پہچان سکتا۔ ویسے میرے نام پر چونکا ضرور تھا۔''

''پھر خیال آیا ہوگا۔ ایک ہی نام کے کتنے چہرے۔'' اسماء ہلکے سے گنگنائی تو وہ ہنس دی۔

''ہاں یقیناً۔''

''اور تم نے کیسے پہچانا نہیں؟''

''بھئی، تم اتنا مکمل خاکہ کھینچا کرتی تھیں اس کا اور پھر ابو جی کے سوئم پر بھی میں نے اسے دیکھا تھا۔''

''بڑی بے ایمان ہو کبھی بتایا نہیں؟'' اسماء نے چھیڑنے کی غرض سے کہا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

''کوئی خوشگوار احساس جاگتا تو ضرور بتاتی۔ اس نے تو محبتوں کی نئی کونپلیں جو دل کی سرزمین پر پھوٹنے لگی تھیں، بے دردی سے روند کر نفرتوں کے بیج بوئے۔ اور یہ کوئی اچھی بات تو نہیں تھی۔ جو میں تمھیں بتاتی۔''

''ہاں زارا! کبھی کبھی زندگی میں وہ کچھ ہو جاتا ہے جو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ تمھارے لئے ڈھولک پر گیت گاتے ہوئے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ یقین کرو مجھے تو یہ سب کچھ ایک خواب سا لگتا ہے۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور سب کچھ ویسا ہی ہوگا۔''

''تمھیں یاد ہے اسماء!'' وہ بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے افسردگی سے کہنے لگی۔

''اس سانحے سے کچھ دن قبل ہم وی سی آر پر ایک فلم دیکھ رہے تھے۔ جس میں ایسا ہی کوئی جہیز کا مسئلہ تھا۔ میں نے کتنا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سب کچھ حقیقی زندگی میں نہیں ہوتا۔''

''ہاں۔'' ہاں کی صورت میں اسماء نے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کی۔ پھر کہنے لگی۔

''اس وقت میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن اب میں سمجھتی ہوں زارا! حقیقی زندگی کے واقعات سے ہی کہانیاں بنتی ہیں۔ یونہی کوئی اپنی طرف سے نہیں اتنا کچھ لکھ سکتا۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔'' اس نے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر زور سے جھٹکا دیا پھر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''میرا خیال ہے اب سونا چاہئے۔ کافی وقت ہو گیا ہے۔''

''واقعی، ورنہ صبح آفس میں اونگھتی رہو گی۔'' اسماء اٹھ کر اپنے بیڈ پر چلی گئی۔

''سنو! ابھی امی کو مت بتانا کہ میں آذر کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔'' اس نے سو
سے پہلے اسماء کو خاص طور سے تنبیہ کی تھی۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا۔ وہ اسماء کے ساتھ صفائی وغیرہ سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ بڑے ما
اور مامی جی آ گئے اور ان کے ساتھ اسد اور سیما بھی تھے۔ جب سے ابو جی کا انتقال ہوا تھا۔ گھر
غیر معمولی سی اداسی ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ اور اگر کوئی آ جاتا تو وقتی طور پر سب بہل جاتے تھے
اس وقت بھی ماموں جی کی بچوں کے ساتھ آمد خوشگوار لگی۔ ٹھہرے ہوئے ماحول میں قدرے ہل
مچ گئی تھی۔ وہ کچھ دیر سب کے ساتھ بیٹھ کر اسماء کو اشارہ کرتی ہوئی اٹھنے لگی تو مامی جی نے اس
ہاتھ پکڑ لیا۔

''بیٹا! کھانے وغیرہ کا تکلف مت کرنا۔ ہم رکیں گے نہیں۔''

''ارے واہ مامی جی۔ اتنے دنوں کے بعد تو آئی ہیں۔ ہم شام سے پہلے تو آ
جانے نہیں دیں گے۔''

''بھئی ہم تو ملنے اور تم لوگوں کی خیریت لینے آئے تھے۔ بس ایک کپ چائے پلا
وہی کافی ہے۔''

''چائے تو میں آپ کو ابھی پلا رہی ہوں۔ پھر بھی شام سے پہلے آپ نہیں جا سکتے۔''

''بیٹا!'' ماموں جی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔

''بس ماموں جی! کوئی عذر نہیں چلے گا، آپ دیکھ نہیں رہے۔ آپ کے آنے سے
کتنی خوش نظر آ رہی ہیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ۔ کھانے میں کیا کھلاؤ گی؟'' ماموں جی ہتھیار ڈالتے ہوئے بولے۔

''جو آپ کہیں گے۔''

''جو میں کہوں گا نہیں بلکہ جو میں لاؤں گا۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی میں گوشت لے آتا ہوں۔ اسٹو بنا دو۔ بہت دن ہو گئے ہیں تمھارے ہاتھ کا
اسٹو کھائے ہوئے۔''

''تو ماموں جی! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ نومی یا شوبی میں سے کوئی لے آئے
گا۔''

''نہیں بیٹا! بچوں کو گوشت لینے کا طریقہ نہیں آتا۔ قصاب جہاں سے کاٹ کر دے دیتا
ہے۔ اٹھا کر لے آتے ہیں۔ میں ذرا اچھا سا گوشت لے آؤں گا۔''

وہ تو نہیں سمجھی لیکن امی ضرور سمجھ گئیں کہ حالات کے پیش نظر ماموں جی ایک وقت کے
کھانے کا بار بھی نہیں ڈالنا چاہتے۔ جبھی خود سودا وغیرہ لینے چلے گئے ہیں۔ مامی جی، امی کی کیفیت
محسوس کر کے فوراً اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی تھیں۔

''میرا خیال ہے، میں پیاز وغیرہ کاٹ لوں۔''

وہ اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگی تو اسماء اور سیما بھی اس کے ساتھ آ گئیں۔

پھر دن کا بیشتر حصہ خاصا خوشگوار گزر گیا۔ کھانے کے بعد ماموں جی آرام کی غرض سے
لیٹ گئے۔ سیما کی اسماء کے ساتھ خاصی بے تکلف دوستی تھی۔ وہ ان دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر
امی اور مامی جی کے پاس آ بیٹھی۔ مامی جی شاید اسی کے بارے میں کوئی بات کر رہی تھیں۔ اسے
دیکھ کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئیں۔ لیکن جب اسے بیٹھے دیکھا تو اپنی بات روک نہ سکیں۔
امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

''زارا کے سسرال والے کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا بھائی صاحب کی برسی تک وہ لوگ
انتظار کر لیں گے؟''

فوری طور پر امی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں۔ دزدیدہ نظروں سے اس کی
طرف دیکھا تو وہ بات سنبھالنے کی غرض سے کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔

''مامی جی! نہ صرف ابو جی کی برسی تک بلکہ اس کے بعد بھی تین چار سال تک انہیں انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ ایک تو میں خود ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔ دوسرے گھر کی بڑی اولاد ہونے کے ناتے جو ذمہ داری میری ہے، میں اسے ہر حال میں نبھانا چاہتی ہوں۔ جب تک نومی اور شوبی کسی قابل نہیں ہو جاتے۔''

''بیٹا! تنا عرصہ کون انتظار کرتا ہے بھلا؟''

''انتظار تو انہیں کرنا پڑے گا۔ اور اگر نہیں کر سکتے تو بے شک.....''

''کوئی غلط بات منہ سے مت نکالنا۔'' مامی جی نے ٹوک دیا۔

''بہر حال۔ میں اپنے گھر کی ناؤ کو بیچ بھنور میں نہیں چھوڑ سکتی اور پھر ابو جی کے بعد اب اپنے لئے تو کوئی بات اچھی سوچی ہی نہیں جاتی۔ کہاں شادی کی بات۔''

اس کی آواز بھرا گئی۔ اور آنکھوں میں پانی اتر آیا جسے چھلکنے سے وہ روک نہ سکی۔

''بیٹا!'' مامی جی نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''روتے نہیں ہیں۔ شاید میں نے قبل از وقت بات چھیڑ دی ہے۔ بہر حال وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم جا کر ہاتھ منہ دھوؤ۔ دیکھو تمہارے رونے سے تمہاری امی پریشان ہو رہی ہیں۔''

وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے اس نے سنا امی کہہ رہی تھیں۔

''اصل میں سب سے بڑی ہے ناں۔ باپ کے زیادہ قریب تھی۔ اور پھر حساس بھی بہت زیادہ ہے۔ میں بھی کوئی بات کرتی ہوں تو یونہی رونے لگتی ہے۔''

امی کو جس بات کا خدشہ تھا۔ اس کی ابتداء ہو گئی تھی۔ مامی جی کے سامنے تو اس نے بات بنا لی تھی لیکن زیادہ عرصہ تک اس طرح بات نہیں بنائی جا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ آج سب لوگ ہمدردی سے اس کی بات سن کر اس کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا

جائے گا۔ ہمدردی صرف آڑ بن کر رہ جائے گی۔

اگلے دن آفس میں بھی وہ خاصی اپ سیٹ رہی۔ ذہن الجھا ہوا تھا۔ مامی جی کی باتیں اور رات دیر تک امی کا فکر مندی سے کروٹیں بدلنا اسے بے حد پریشان کر رہا تھا۔

''مجھے مامی جی کے سامنے بات نہیں بنانی چاہئے تھی۔'' اس نے سوچا۔

''اس طرح تو ہر بار مجھے ایک نیا عذر تراشنا پڑے گا۔ اور میں کب تک لوگوں کو جھوٹی داستانیں سناتی رہوں گی۔ میں ایک ہی بار کیوں نہیں سب لوگوں کے سامنے سچ بول کر بری الذمہ ہو جاتی۔''

دل چاہا اسی وقت کسی اونچی سی جگہ پر کھڑی ہو کر چیخ چیخ کر اعلان کرے۔

''میں آذر سے شادی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔ اس لئے کہ وہ میرے باپ کا قاتل ہے۔''

''بیٹیوں والے کبھی قصوروار نہیں ہوتے لیکن ہمیشہ قصوروار ٹھہرائے جاتے ہیں۔'' امی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ اور پھر یہ کہہ کر انہوں نے شاید اسے اس کے ارادے سے باز رکھا تھا۔

''لوگ کہیں گے باپ کے مرتے ہی بیٹی نے من مانی شروع کر دی۔''

''میرے خدا، یہاں تو سچ بولنے کی سزا بھی کڑی ہے۔''

اس نے دکھ سے سوچا اور ٹائپ رائٹر پر انگلیوں کی حرکت تیز کر دی۔ آذر نے اسے کوئی بہت ضروری لیٹر ٹائپ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ جو اس کی ذہنی الجھن کا شکار یوں ہوا کہ خط کی بجائے درخواست بن گیا۔ درخواست بھی وہ جو میونسپل کمیٹی کو لکھی گئی ہو۔ ٹائپ رائٹر سے کاغذ نکال کر اگر وہ اس پر ایک نظر ڈال لیتی تو شاید اپنی غلطیوں کا احساس ہو جاتا۔ لیکن اس نے تو یونہی کاغذ کھینچ کر اندر بھجوا دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں فوراً اس کا بلاوا آ گیا۔

''بیٹھیں پلیز۔'' وہ اس کا ٹائپ کیا ہوا لیٹر دیکھ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر بیٹھنے

کے لئے کہا اور وہ جب اس کے سامنے بیٹھی تو اس پر نظر پڑتے ہی اس کے اندر ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہی..... وہ شخص ہے جس نے مجھے نفرتوں سے آشنائی بخشی۔ اس کی بدولت میں گزشتہ کئی ماہ سے سکون کے چند لمحات کو ترس رہی ہوں۔ اور اسی کی وجہ سے سچ میرے لئے سزا بن گیا ہے۔''

''مس عمر!'' وہ اسے متوجہ کر رہا تھا لیکن وہ اندر کے شور میں اس کی آواز سن ہی نہ سکی۔ بظاہر نظریں اسی پر مرکوز تھیں۔ لیکن ذہن اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر ہاتھ میں پکڑا کاغذ اس انداز سے اوپر اٹھایا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ وہ چونکی اور گھبرا کر اپنے اطراف میں دیکھنے لگی اور وہ یوں بن گیا جیسے اس وقت سے اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوا ہو۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی ہو گی۔ تب اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''آپ کچھ پریشان ہیں؟''

''نہیں۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''کوئی پرابلم؟''

''نو سر! نہ پریشانی نہ پرابلم بلکہ سب ٹھیک ہے۔''

''اگر سب ٹھیک ہے تو پھر یہ کیا ہے؟'' اس نے اس کا ٹائپ کیا ہوا لیٹر اس کی طرف بڑھایا تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی اسے اور کبھی اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

''ایک نظر اسے دیکھ لیں۔'' اس نے کہا تو وہ کاغذ لے کر اس پر نظریں دوڑانے لگی۔

''یہ خدا اتنی غلطیاں!'' اندر ہی اندر خجالت محسوس کرتے ہوئے سوچا۔

''میں اسے دوبارہ ٹائپ کر دیتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی کہ اس نے روک دیا۔

''آپ بیٹھیں۔ میں یہ کام ہمدانی سے کروا لیتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے بیل بجا کر چپڑاسی کو بلایا۔ اور وہ لیٹر ہمدانی کے پاس ٹائپ کروانے کے لیے بھیج دیا۔ پھر اس کی طرف متوجہ ہوا تو کہنے لگا۔

''اب تو اعتراف کر لیں کہ کسی پریشانی نے آپ کے کام میں خلل ڈالا ہے۔''

''میں اعتراف کر بھی لوں تو۔'' وہ خاموش ہو گئی۔ اس سے کیوں کہے۔

''میں یہ دعویٰ تو نہیں کروں گا کہ آپ کی پریشانی دور کر دوں گا۔ لیکن کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔''

''مجھے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کرنا۔'' پھر جیسے اپنے آپ سے بولی تھی۔

''بوجھ ہلکا ہو گیا تو معافی کے در کھل جائیں گے اور تمہارے لئے کوئی معافی نہیں۔''

''کمال ہے لوگ تو بھڑاس نکالنے یا بوجھ ہلکا کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور آپ.....''

''میں بھی ایسا ہی کرتی ہوں۔ لیکن اپنوں کے سامنے۔''

وہ جو میز کی سطح پر کہنیوں تک بازو رکھے قدرے آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس کی بات پر فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

''چلیے آج گھر جا کر اپنوں کے سامنے سارا بوجھ ہلکا کر لیجئے گا تاکہ کل کام میں کوئی خلل نہ پڑے۔''

''ایسا ہی کروں گی۔'' اس نے اعتماد سے کہا اور کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب میں جاؤں؟''

''ضرور۔'' وہ اسے جاتے اور دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

شام کو گھر آتے ہی وہ واقعی امی سے الجھ پڑی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں سب کو بتا دینا چاہئے کہ ہم نے آذر کے گھر والوں سے رشتہ توڑ لیا ہے۔

''آخر کیوں اور یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' امی پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

''اس لئے کہ کل مامی جی کے سامنے میں نے بات بنا تو دی تھی لیکن اس کے بعد مجھے ایک پل کے لیے چین نہیں ملا۔ میں بار بار سب کو مطمئن نہیں کر سکوں گی۔ اس لئے آپ ایک ہی بار سچ بول دیں۔''

''میں سچ بول دوں گی بیٹا! لیکن پہلے یہ تو دیکھنے دو کہ آذر کے گھر والے کیا چاہتے ہیں۔''

''وہ اگر کچھ چاہتے ہوتے تو آتے ناں۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ ان کی طرف سے کوئی بھی نہیں آیا۔ اور آپ اب بھی کوئی امید رکھے ہوئے ہیں۔''

''بیٹا! انہیں گھر بدلنے کی اطلاع ہم نے خود نہیں دی۔ ہو سکتا ہے وہ تلاش میں ہوں۔''

''کوئی ایسا مشکل پتا نہیں ہے ہمارا۔ وہ اگر آنا چاہتے تو کسی سے بھی پوچھ کر آ سکتے تھے۔ میرا خیال ہے آذر، تایا جی کا گھر جانتا ہے۔''

''ہاں۔ ایک بار تمھارے ابو جی کے ساتھ گیا تو تھا۔'' امی پر سوچ انداز میں بولیں۔

''بہر حال تم فکر مت کرو۔ اب کوئی تمھاری بابت پوچھے گا تو میں خود بات کر لوں گی۔''

''کیا بات کریں گی؟''

''یہی کہ ہم نے وہاں سے بات ختم کر دی ہے۔''

اسے امی جان کی بات پر اسی وقت مطمئن ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں اسے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے بہت کوشش کرنی پڑی۔ اور پتا نہیں وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئی بھی کہ نہیں۔

''زارا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم چاہتی کیا ہو؟'' رات میں اسماء حسبِ معمول سونے سے پہلے اس کے بیڈ پر بیٹھی تو کہنے لگی۔

''ایک طرف تو تم امی کو مجبور کر رہی ہو کہ یہ رشتہ ختم کر دیں۔ اور دوسری طرف خود آذر بھائی کے ساتھ ربط بڑھا رہی ہو۔ آخر یہ سب کیا ہے؟''

''وقت آنے پر خود ہی سمجھ جاؤ گی کہ یہ سب کیا ہے۔ ابھی پلیز اس موضوع پر کوئی بات نہ کرو۔''

''نہیں زارا! آخر مجھے بھی تو پتا چلے کہ تم کیا کرنے جا رہی ہو۔''

''میں کچھ نہیں کر رہی۔ اب جاؤ اپنی جگہ پر۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

اسماء اٹھنا نہیں چاہتی تھی لیکن اسے کروٹ بدلتے دیکھ کر مجبوراً اپنی جگہ پر چلی آئی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ زندگی کافی حد تک معمول پر آ گئی تھی۔ اور جہاں اسے اپنے مقصد میں کچھ کامیابی ہوئی یعنی آذر اس کی طرف مائل ہونے لگا تھا۔ وہاں گھر میں بھی ایک خوشگوار سا ہنگامہ جاگنے لگا تھا۔ تایا جی اپنے بیٹے نوید کے لئے اسماء کو مانگ رہے تھے۔ امی شش و پنج میں تھیں۔ ظاہر ہے بڑی کی موجودگی میں چھوٹی کو نہیں بیاہ سکتی تھیں۔ لیکن تایا جی نے اطمینان دلایا کہ جب تک زارا کی کہیں بات نہیں ہو جاتی وہ شادی کے لئے شور نہیں مچائیں گے۔ ویسے تایا جی کا خیال نوید کے لئے زارا کو مانگنے کا تھا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ نوید نے خود اسماء کا نام لے دیا تھا۔ بہر حال ان کے لئے دونوں بھتیجیاں ایک جیسی تھیں۔ یوں گھر کی ایک چھوٹی سی تقریب میں تائی جی نے اسماء کو انگوٹھی پہنا دی۔

☆☆☆

''اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک ذاتی سوال پوچھوں؟''

اسے لیٹر ڈیکٹیٹ کرواتے ہوئے اچانک آذر نے کہا تو اس کا تیزی سے چلتا ہوا قلم رک گیا۔ اور وہ سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپ انگیج ہیں؟'' اس کے پوچھنے پر فوری طور پر جواب نہ دے سکی۔ اصل میں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

''آپ شاید مائنڈ کر گئیں؟''

''نہیں تو۔'' وہ فوراً بولی۔

''پھر میں نے کوئی اتنا مشکل سوال تو نہیں کیا، جو آپ سوچ میں پڑ گئیں۔''

''سوال تو مشکل نہیں ہے آذر صاحب! جواب مشکل ہے۔''

''ارے ایک ذرا سی ہاں یا ایک ذرا سی ناں کہنے میں کیا مشکل ہے۔''

''یہ دونوں باتیں ہیں۔''

''کیا مطلب ہے؟''

''یعنی انگیج ہوں بھی اور نہیں بھی۔''

''میں بالکل نہیں سمجھا۔''

''اصل میں، میں جس شخص کے ساتھ منسوب ہوں۔ اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ ایک لالچی انسان ہے اور اس کے لالچ ہی نے میرے ابو جی کی جان لے لی۔'' وہ اس پر نظریں جما کر بولی۔

''ارے!'' وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

''کیا ہوا تھا؟ میرا مطلب ہے، کیا کیا تھا اس نے؟''

''شادی سے صرف پانچ دن پہلے اس نے بھاری جہیز کا مطالبہ کر دیا۔ اس کی والدہ آئی تھیں، کہنے لگیں، اگر جہیز میں فریج، ٹی وی اور واشنگ مشین وغیرہ نہیں ہیں تو ہماری طرف سے بات ختم سمجھیں۔''

''آپ کے والدین کو اسی وقت بات ختم کر دینی چاہئے تھی۔''

اس کے کہنے پر وہ کچھ دیر ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر کہنے لگی۔

''میں نے بھی اس وقت یہی سوچا اور چاہا تھا۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا، کیونکہ تمام عزیز

رشتہ داروں میں کارڈز تقسیم ہو چکے تھے، اور پھر گھر میں مہمان بھی موجود تھے۔ اسی وقت بات ختم کر دیتے تو پھر اتنے سارے لوگوں کو کیا جواب دیتے۔ مجبوراً ابو جی نے ہامی بھر لی۔ لیکن شاید ان سے انتظام نہیں ہو سکا تھا، جبھی ان کا اگلے دن ہارٹ فیل ہو گیا۔''

''ویری سیڈ!'' وہ تاسف سے سر ہلاتا ہوا بولا۔

''آپ ہی بتائیے، کیا مجھے اس شخص سے شادی کرنی چاہئے جو میرے ابو کا قاتل ہے۔''

''بالکل نہیں۔ اور کیا آپ نے اپنے فادر کی ڈیتھ کے بعد اس سے رشتہ ختم نہیں کر دیا۔''

''میں نے تو خیر اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اس سے شادی نہیں کروں گی۔ لیکن میری والدہ شاید کچھ خوفزدہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زیادہ تر لوگ ہمیں ہی الزام دیں گے۔ اس لئے شش و پنج میں ہیں اور صاف انکار بھی نہیں کر رہیں۔''

''اور وہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ان لوگوں نے تو ابو جی کے سوئم کے بعد سے ہمارے گھر میں جھانکا بھی نہیں۔ پتا نہیں شرمندہ ہیں یا مایوس ہو گئے ہیں۔''

''شرمندہ کیا ہوں گے۔ ایسے ذلیل لوگ کبھی شرمندہ نہیں ہوا کرتے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' وہ اب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گزری باتوں کا عکس تلاش کر رہی تھی۔

''آئی ایم سوری زارا! کہ میں نے یونہی ایک بات پوچھ کر آپ کو گزری ہوئی باتیں یاد دلائیں۔''

''یادتو ان کو کیا جاتا ہے جو بھول جائیں۔ اور میں تو کبھی بھولی ہی نہیں۔''

''آپ افسردہ تو ہوئیں؟'' اس نے طویل سانس لیتے ہوئے پیڈ اور قلم اٹھا لیا۔

''یہ باتیں تو جب بھی چھیڑیں گی، افسردہ ہی کریں گی۔ آپ لیٹر مکمل کروایئے ٹائپ کروں گی۔''

''میرا خیال ہے، اسے رہنے دیں، کل لکھوادوں گا۔''

''جیسے آپ کی مرضی!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے آئیں۔

''واقعی کمال شخص ہے۔'' رات میں وہ اسماء سے کہہ رہی تھی۔

''مجال ہے، جو میری کسی بات پر چونکا ہو۔ یوں انجان بنا رہا جیسے اس سارے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔''

اپنی بات کا ردعمل دیکھنے کے لئے اس نے اسماء کی طرف دیکھا تو وہ گم صم سی بیٹھی تھ وہ متعجب ہوئی۔

پھر اس کا گھٹنا ہلا ڈالا۔

''اے تم کہاں کھوئی ہوئی ہو؟''

''میں آذر بھائی کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔'' اسماء اس کی طرف دیکھتے ہو بولی۔

''میں حیران ہوں۔ لوگ اتنی جلدی کیسے بدل جاتے ہیں۔ آذر بھائی جب ہمار ہاں آیا کرتے تھے، تو میں شوبی اور نومی ان کی شخصیت کے سحر میں کھو جایا کرتے تھے۔ ان کی با اور دھیما دھیما لہجہ بہت متاثر کن تھا۔ اور پتا ہے زارا! جب تم نے ابو جی کی موت کا ذمہ دار انہ ٹھہرایا تو مجھے بہت دکھ ہوا، میں نے سوچا آذر بھائی کبھی بھی ایسے نہیں ہو سکتے، اور اب تک میرا تمھاری باتوں کی نفی کرتا آ رہا تھا۔ لیکن آج.....'' اسماء خاموش ہوئی تو وہ فوراً پوچھنے لگی۔

''آج کیا؟''

''آج شوبی بتا رہا تھا۔ اس کی آذر بھائی سے ملاقات ہوئی تھی، یوں ہی سرِ راہ۔''

''پھر۔؟''

''پھر شوبی کا کہنا ہے کہ وہ کچھ اکھڑے اکھڑے سے تھے۔ ڈھنگ سے بات بھی نہیں کی۔ شوبی نے گھر آنے کے لئے کہا تو ٹال گئے، اور پھر کسی کام کا بہانا کر کے فوراً چلے بھی گئے۔''

وہ کچھ دیر تک جانے کیا سوچتی رہی پھر پوچھنے لگی۔

''شوبی نے یہ بات امی کو بتائی؟''

''ہاں اور امی کو بہت دکھ ہوا۔ وہ تو اب تک آس لگائے بیٹھی تھیں، اور پتا ہے زارا! ابھی کچھ دن پہلے امی مجھ سے کہہ رہی تھیں۔ کہ زارا تو یونہی جذباتی ہو رہی ہے۔ میں خود کسی دن آذر کے ہاں چکر لگا کر آؤں گی۔''

''کیا؟'' وہ دبی دبی سی آواز میں چیخی۔

''ہاں زارا! اور آئی ایم سوری، کہ میں نہ صرف امی کی بات سے متفق تھی بلکہ ان کے ساتھ بھی جانا چاہتی تھی، لیکن آج جب شوبی نے آذر بھائی کے بدلے رویے کے بارے میں بتایا تو.....''

''بہت خوب.....!'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''میں جو اتنے عرصے سے بکواس کر رہی تھی کہ وہ لالچی لوگ اب ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ کیونکہ ابو جی کے ساتھ ہی ان کو بھاری جہیز ملنے کی امید ختم ہو گئی ہو گی، تو کسی نے یقین نہیں کیا، اور آج شوبی نے دیکھ لیا تو.....''

''پلیز زارا! طنز مت کرو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔''

اسماء واقعی نادم تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ دل تو چاہا خوب باتیں سنائے، لیکن اس کی شکل ایسی ہو رہی تھی کی رحم آ گیا۔

''چلو اچھا ہے۔ کسی طرح تمھیں اور امی کو یقین تو آیا۔ اور اس سے اچھا یہ ہوا کہ امی ان کے گھر نہیں چلی گئیں۔ پتا نہیں وہ لوگ کس طرح پیش آتے۔''

''میں خود اس وقت سے یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں، اگر ہم ان کے چلے جاتے اور وہ ہمیں صاف جواب دے دیتے تو کتنی بے عزتی ہوتی ہماری۔''

''فکر مت کرو۔ ایسی بے عزتی اب آذر کا مقدر ہو گئی ہے۔ شوبی کے بلانے پر مٹول سے کام لے رہا تھا۔ دیکھنا سر کے بل آئے گا، وہ بھی سوالی بن کر اور خالی ہاتھ نہ لوٹایا تو نام بدل دینا۔''

وہ دانت پیس کر کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی توقع کے عین مطابق آذر نے آفس آتے ہی اسے اپنے کمرے میں بلوا؛ اور جب وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی تو کہنے لگا۔

''کل یہاں سے جانے کے بعد میں سارا وقت آپ کے بارے میں سوچتا رہا۔''

''میرے بارے میں؟'' وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

''ہاں زارا۔'' آپ کے ساتھ جو سانحہ ہوا۔ وہ واقعی افسوسناک ہے اور یقیناً آپ لوگوں سے متنفر ہو گئی ہوں گی۔'' اس کے سر جھکانے پر کہنے لگا۔

''لیکن۔ میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کل جب میں آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کہیں انگیج تو نہیں تو میں آپ کا جواب نفی میں سننے کا خواہشمند تھا۔ ہیں کیوں؟'' وہ یقیناً جانتی تھی، لیکن اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

''میں آپ کو پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔'' اس کے لئے یہ تعجب کی بات نہیں تھی پھ متعجب ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا بولی۔

''آپ؟''

''ہاں! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔''

''لیکن سر، ابھی تو وہ معاملہ ختم نہیں ہوا، کیونکہ میری امی.....''

''اپنی امی کو سمجھائیں کہ آپ کبھی وہاں خوش نہیں رہ سکیں گی۔'' وہ فوراً اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔

''میں امی کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن وہ شاید کچھ خوفزدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر وہاں سے میری نسبت ٹوٹ گئی تو پھر شاید کبھی کوئی میرا ہاتھ تھامنے نہیں آئے گا۔''

''میں آ تو گیا ہوں۔'' وہ بے اختیار کہہ گیا۔

''آذر صاحب! کہیں آپ مجھ سے ہمدردی کی بنا پر تو...''

''کم آن زارا!'' وہ فوراً بول پڑا۔

''ہمدردی کرنے کے لئے اور بہت لوگ ہیں۔'' اس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگا۔

''پھر میں کب اپنی والدہ کو بھیجوں؟''

''ابھی نہیں، میں پہلے گھر میں آپ کا تذکرہ کر لوں پھر...''

''او کے، لیکن ذرا جلدی۔'' اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''چائے چلے گی؟'' اس کے اثبات پر سر ہلانے پر انٹر کام پر چائے کے لئے کہا۔ پھر اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔

''آج واقعی مجھے یقین آ گیا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میری والدہ گزشتہ پانچ برسوں سے میری شادی کے لئے کوششیں کر رہی ہیں، لیکن اتفاق دیکھئے کہ کہیں بات نہیں بنی۔ بعض جگہ تو منگنی تک بھی ہو گئی، لیکن شادی کی نوبت نہیں آئی۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں، میں خود نہیں سمجھ سکا کہ اچانک لڑکی والے بات کیوں ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن

اب میں سمجھ گیا ہوں ایسا کیوں ہوتا رہا۔''

''کیوں ہوتا رہا؟''

''اس لئے کہ آپ کو جو میری زندگی میں آنا تھا۔ اور ایک مزے کی بات بتاؤں، آخری لڑکی جس سے میری منگنی ٹوٹی، اس کا نام بھی زارا تھا۔''

''اچھا!'' وہ اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

''اس سے منگنی کیوں ٹوٹی؟''

''وہ شاید کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ لیکن اپنے فادر کے ڈر سے خاموش رہی۔ جب اس کے فادر کی ڈیتھ ہو گئی تو اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع مل گیا۔''

ایسے ہی خدشے کا اظہار امی نے بھی کیا تھا اور اس کے منہ سے یہ بات سن کر اس کے ہونٹ بھینچ گئے تھے۔ اور آنکھوں کی پتلیاں سکڑنے لگیں۔ اس سے اپنی کیفیت چھپانے کی غرض سے وہ یونہی نیچے جھک گئی۔ جب سیدھی ہوئی تو چپڑاسی چائے لے کر آ رہا تھا۔ اس کے سامنے کپ رکھا تو اس نے فوراً اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر چائے پیتے ہی اس کے کمرے سے ہی نہیں آفس سے بھی نکل آئی۔ اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اگر کچھ دیر اور اس کے سامنے بیٹھتی تو یقیناً اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر وہیں سارا حساب بے باق کرنے کھڑی ہو جاتی۔

اس کا خیال تھا گھر جاتے ہی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے چپ چاپ لیٹ جائے گی لیکن امی کا سامنا ہوتے ہی ضبط جواب دے گیا۔ ان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔

''ارے کیا ہوا؟'' امی ایک دم پریشان ہو گئیں۔

''آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ لوگ مجھے ہی الزام دیں گے کہ باپ کے مرتے ہی بیٹی نے من مانی شروع کر دی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''اور سب سے پہلے ایسی گھٹیا بات کہنے والا کوئی اور نہیں خود آذر ہے۔''

''آذر۔!'' امی کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی، پھر اسے کندھوں سے تھام کر

اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''تم کہاں آذر سے ملیں؟''

''میں۔'' وہ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے لمحہ بھر کو گڑبڑا گئی۔ اب کیا جواب دے۔ لیکن اب کچھ چھپانا بھی فضول تھا۔ اس لئے اصل بات بتا دی۔ آخر میں کہنے لگی۔

''پہلے میرا مقصد اسے صرف سبق سکھانا تھا لیکن اب......''

''زارا!'' امی نے ٹوک دیا۔

''میں نے تمھیں پہلے بھی کہا تھا، اور اب پھر یہ کہہ رہی ہوں کہ جو ہوا سب بھول جاؤ۔ لوگ اسی طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ اور ہم کسی کی زبان نہیں پکڑ سکیں گے۔''

''لیکن میں آذر کی زبان ضرور پکڑوں گی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تھی۔

پھر امی نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ وہ کسی طرح سے بھی اس سے متفق نہیں تھیں۔ لیکن وہ شاید زندگی میں پہلی بار کسی بات پر اڑی تھی اور اس کی ضد سے مجبور ہو کر امی نے ہتھیار ڈال تو دیے۔ لیکن جس روز آذر کو آنا تھا۔ اس روز امی اسماء کو لے کر تایا جی کے گھر چلی گئیں۔

آذر کے آنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ اس نے جلدی سے چائے کا پانی چولہے پر رکھا، پھر ڈرائنگ روم میں آ [illegible] تصویر کارنر سے اٹھا کر بڑے صوفے کے عین سامنے رکھ دی۔ اس کا خیال تھا کہ آذر دروازے سے داخل ہوتے ہی اسی صوفے پر بیٹھے گا اور وہ چاہتی تھی کہ وہ بیٹھتے ہی اس تصویر کو دیکھ لے تا کہ اسے اپنا تفصیلی تعارف کرانے کی ضرورت نہ پڑے۔ بیل کی آواز پر وہ چونکی اور دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر پھیلاتی ہوئی آ کر دروازہ کھولنے لگی۔

''ہیلو!'' اسے دیکھ کر وہ خوشدلی سے مسکرایا تو جواب میں وہ کوشش کے باوجود ہلکی سی مسکراہٹ بھی ہونٹوں پر نہ لا سکی۔

''کیا یہیں سے بھیجنے کا ارادہ ہے؟''

''ارے نہیں!'' اس نے سامنے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا، پھر دروازہ بند کر کے اس کے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔

''گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟'' وہ فوراً غیر معمولی خاموشی محسوس کر گیا تھا۔

''اصل میں ابھی کچھ دیر پہلے تایا جی نے پتا نہیں کس لئے بلوا بھیجا۔ امی میری چھوٹی بہن کو لے کر ان کی طرف گئی ہیں۔''

''پھر تو میرا بیٹھنا بیکار ہے۔''

''نہیں۔ آپ بیٹھیں، میں چائے لے کر آ رہی ہوں۔''

''نہیں زارا! یہ مناسب نہیں لگتا، اور پھر مجھے تو آپ کی والدہ سے ملنا تھا۔''

''ہاں لیکن میں آپ کو چائے پیئے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ بس میں ابھی لے کر آتی ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد چائے لے کر واپس آئی تو وہ اس کی توقع کے مطابق ابو جی کی تصویر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ آہٹ پر چونکا اور سامنے اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''یہ تصویر کس کی ہے؟'' اس نے فوری طور پر جواب نہیں دیا۔ ٹرے میز پر رکھ کر، خود بھی وہیں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔

''یہ تصویر کس کی ہے؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''میرے ابو جی کی۔'' اطمینان سے جواب دے کر اس کی طرف دیکھا، اور اسے غیر یقینی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر بظاہر سادگی سے پوچھنے لگی۔

''آپ جانتے ہیں میرے ابو جی کو؟''

''ہاں لیکن۔'' وہ شاید الجھ رہا تھا۔

''لیکن کیا؟''

''تم وہ کیسے ہو سکتی ہو۔''

''کیوں، میں وہ کیوں نہیں ہو سکتی۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''میں وہی ہوں آذر احسان الحق۔ جس کی انگلی میں چھ ماہ تک تمھارے نام کی انگوٹھی پڑی رہی۔''

''لیکن تم نے تو مجھے اپنے بارے میں کوئی اور کہانی سنائی تھی۔''

''کہانی نہیں آذر صاحب! میں نے حقیقت بتائی تھی۔ میری زندگی کی سب سے تلخ حقیقت یہی ہے کہ شادی سے صرف پانچ روز پہلے تمھاری والدہ اور بہنیں جہیز کی لمبی لسٹ لے کر آئی تھیں، جنہیں پورا کرنا شاید ابو جی کے بس میں نہیں تھا۔ جبھی چپ چاپ چلے گئے بنا کچھ کہے۔''

''یہ سب جھوٹ ہے زارا!'' وہ اٹھ کر اس کی طرف آتا ہوا بولا۔

''ہماری طرف سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ تمھیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ یا پھر کسی نے یونہی۔''

''نہیں آذر! نہ کوئی غلط فہمی اور نہ ہی کسی نے بری نیت سے بہکانے کی کوشش کی۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ تمھاری والدہ فریج ٹی وی اور واشنگ مشین کا مطالبہ کر رہی تھیں، اور تم اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو، کیوں جھٹلا رہے ہو اس حقیقت کو، تم بے خبر تو نہیں ہو گے۔'' وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا بے بس نظر آنے لگا۔

''ویسے تم کمال شخص ہو کہ اس روز میرے منہ سے اپنی حقیقت سن کر انجان بنے رہے۔ یوں جیسے میں تمھارے متعلق نہیں واقعی کسی اور کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔'' اس کے سر جھکانے پر کہنے لگی۔

''تم نے مشورہ دیا تھا ناں کہ ایسے ذلیل اور لالچی لوگوں سے رشتہ توڑنا ہی بہتر ہے۔ گو یہ فیصلہ تو میں خود بھی اسی روز کر چکی تھی۔ جس روز ابو جی تمھارے مطالبات کے سامنے زندگی ہار

گئے تھے۔لیکن یہ انگوٹھی۔'' اس نے بڑھ کر ریک پر سے انگوٹھی اٹھائی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی۔

''یہ ہر دم مجھے احساس دلاتی ہے کہ اسے دینے والا میرے ابو جی کا قاتل ہے۔'' وہ ہونٹ بھینچ کر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔

''لو اسے اور اب بے شک اپنی حقیقت چھپانے کے لئے لوگوں میں علی الاعلان کہتے پھرنا کہ باپ کے مرتے ہی بیٹی نے من مانی شروع کر دی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے انگوٹھی اس کی طرف اچھال دی، جسے پکڑنے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔ بہت خاموشی سے انگوٹھی کو اپنے پیروں میں گرتے دیکھا۔ کچھ دیر تک یونہی کھڑا رہا، پھر جب اس کی طرف دیکھا تو وہ پیٹھ موڑ چکی تھی۔

''میں اس وقت تم سے کچھ بھی کہوں، خواہ کتنی بڑی قسم کھا کر۔ تم میرا یقین نہیں کرو گی۔ اس لئے کہ تم اس وقت اپنے یقین کے زعم میں کھڑی ہو کہ جو تم کہہ رہی ہو، صرف وہی سچ ہے، اور زارا! اگر یہی حقیقت ہے جو تم نے کہی ہے تو بخدا مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ اور نہ ہی اب تک میرے علم میں ایسی کوئی بات آئی۔''

''میں تمھاری کسی بات کا یقین نہیں کروں گی، تم پلیز چلے جاؤ۔'' وہ اسی طرح رخ موڑتے ہوئے بولی۔

''یوں نہیں زارا۔ میری تذلیل کا جو طریقہ تم نے سوچا تھا۔ اس پر پوری طرح عمل کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہو، دفع ہو جاؤ۔''

''ہاں، ہاں۔ دفع ہو جاؤ۔'' وہ اس کی طرف مڑتے ہوئے زور سے چیخی۔

''تم میرے ابو جی کے قاتل ہو۔ کاش میں تمھیں دار پر چڑھا سکتی۔''

وہ اس کی آنکھوں سے پھوٹتی نفرت کی چنگاریاں دیکھ کر افسردگی سے مسکرایا۔ اور ''پھر آؤں گا'' کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

وہ کچھ دیر تک ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی پھر پلٹ کر ابو جی کی تصویر پر نظریں جما دیں۔ ابو جی کی یہ تصویر جو ہمیشہ ہنستی مسکراتی ہوئی لگتی تھی۔ اس وقت کسی اور روپ میں ڈھل رہی تھی۔ اور وہ جو اپنی کامیابی پر خوش ہوئے جا رہی تھی۔ اندر ہی اندر سہم گئی۔

رات میں اسماء نے اس سے بہت پوچھا کہ اس نے آذر کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا لیکن اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' وہ کروٹ بدلنے لگی تھی کہ اسماء نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں تمھیں ایسے سونے نہیں دوں گی، آخر تم بتاتیں کیوں نہیں؟''

''میں نے صرف اسے اپنی پہچان کروائی تھی اور بس۔''

''اور ان کا ردِ عمل کیا ہوا؟''

''تم خود سوچ سکتی ہو۔'' اس نے جان چھڑائی۔

''ہاں سوچ سکتی ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ تم اتنی اپ سیٹ کیوں ہو؟ تمھیں تو خوش ہونا چاہئے کہ جو۔''

''میں خوش ہونا چاہتی ہوں۔'' وہ اسماء کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

''لیکن پتا نہیں کیوں اچانک میرا دل سہم گیا ہے۔ جیسے کسی جرم کی مرتکب ہوئی ہوں۔''

''کسی کی دل آزاری جرم ہی تو ہے۔''

''ہاں لیکن۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا وہ کیا تھا؟''

''میں مانتی ہوں، ہمارے ساتھ اچھا نہیں ہوا، لیکن کیا یہ ضروری تھا کہ تم انتقاماً اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو، کبھی کبھی معاملہ خدا پر بھی چھوڑ دینا چاہئے۔''

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''بہرحال جو کچھ تم نے کیا۔ اگر اس پر خوش نہیں ہو سکتیں تو پلیز آزردہ بھی مت ہو۔''

اس نے ہلکے سے مسکرا کر سر ہلایا تو اسماء اس کا کندھا تھپکتے ہوئے اٹھ کر اپنی جگہ پر آ گئی۔

رات اسماء کے سونے کے بعد وہ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ اس لئے صبح خود سے اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ امی نے دو تین بار اٹھایا لیکن وہ کسمسا کر پھر سو گئی۔

''بیٹا! آفس نہیں جانا کیا؟''

''آفس۔'' اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر امی کی طرف دیکھا۔

''نہیں امی! اب کہیں اور جاب تلاش کروں گی۔''

''ٹھیک ہے پھر کچھ دن آرام کر لو۔''

امی نے پھر اسے نہیں جگایا۔ وہ خود جب اٹھی تو دس بج چکے تھے۔ اسماء صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر دوپہر کے کھانے کے لئے سبزی بنا رہی تھی۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر اپنے لئے چائے بنائی اور مگ لے کر اندر آ گئی۔

''ناشتہ نہیں کرو گی؟'' امی اسے خالی چائے پیتے دیکھ کر کہنے لگیں۔

''دل نہیں چاہ رہا۔'' اس نے کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ اس وقت کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن آپ ہی آپ گزری شام کا واقعہ یاد آنے لگا، اور ابھی وہ اپنا محاسبہ کرنے ہی لگی تھی کہ اسماء اسے پکارتی ہوئی آ گئی۔

''زارا! تمہارے آفس سے کوئی آدمی یہ لفافہ دے گیا ہے۔''

''کون تھا؟''

''پتا نہیں۔'' اسماء لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما کر چلی گئی تو وہ کچھ دیر تک یونہی سفید لفافے پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ جس پر صرف اس کا نام لکھا تھا، پھر اندر سے تہ شدہ کاغذ نکال کر کھولا اور کچھ انجانی اور کچھ جانی پہچانی تحریر پر نظریں دوڑانے لگی۔

''زارا!

اپنی صفائی میں کچھ کہنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنے حالات سے آگاہ کر دوں۔ میں بہت چھوٹا سا تھا، جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا، پھر کچھ ہی عرصے بعد یہ خاتون میری ماں بن کر آ گئیں۔ آج کے حالات کے پیش نظر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری دوسری ماں اگر اپنی کوکھ سے کسی بیٹے کو جنم دیتی تو میرے ساتھ اس کا رویہ خالص سوتیلی ماؤں جیسا ہوتا، لیکن شاید قدرت مجھ پر مہربان تھی کہ اس کی گود میں یکے بعد دیگرے چار بیٹیاں ڈال کر میری حیثیت اپنی جگہ برقرار رہنے دی۔ یوں اگر اس نے چاہا بھی ہو گا تو بھی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے مجھ سے اپنا رویہ تبدیل نہیں کیا، جبھی تو آج تک میرے عزیزوں کے علاوہ کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ میری اپنی ماں نہیں ہیں۔

اور زارا! کل تک تو میں انہیں ایک مثالی ماں سمجھتا تھا۔ جنہوں نے اپنی اولاد سے زیادہ میرا خیال رکھا۔ اگر میں اپنی پوری زندگی پر نظر ڈالوں تو ایسا کوئی ایک لمحہ گرفت میں نہیں آتا، جب انہوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو۔ جبھی تو اپنے والد کے انتقال کے بعد میں، انہیں ہی اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھا، اور اپنی زندگی کا سارا اختیار ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

دو بہنوں کی شادیوں کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد جب میں اپنے بارے میں سوچنے لگا تو ماں جی نے خوشی کا اظہار کیا اور اسی وقت سے میرے لئے لڑکی کی تلاش شروع کر دی، میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ کئی جگہ میری بات طے ہوئی اور پھر ٹوٹ گئی۔ میں اب تک اسے قسمت کا کھیل سمجھتا رہا۔ لیکن کل تمہارے ہاں سے آنے کے بعد جب میں حالات کے بارے میں سوچنے بیٹھا تو یہ مجھے قسمت کا نہیں ماں جی کا کھیل نظر آیا۔ اصل میں ماں جی چاہتی ہی نہیں ہیں کہ میں شادی کروں، کیونکہ وہ اندر سے خوفزدہ ہیں کہ آج کل تو اپنی سگی اولاد شادی کرتے ہی ماں بہنوں کو فراموش کر دیتی ہے، اور پھر میں تو ان کی سوتیلی اولاد ہوں، مجھ پر اگر انہوں نے اعتبار نہیں کیا، تو اس میں ان کا قصور نہیں ہے۔ حالات نے انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کیا۔

بہرحال میں نے اپنی چھوٹی بہن کو اعتماد میں لے کر اس سے تمھاری باتوں کی تصدیق کی، براہِ راست ماں جی سے تصدیق یوں نہیں کی کہ میں نہیں چاہتا کہ بقیہ زندگی وہ میرے سامنے شرمسار رہیں۔ کچھ بھی سہی وہ مجھے پرورش کرنے کی سزاوار تو ہیں۔ اور یہ انہی کی تربیت ہے کہ آج میں زندگی میں اچھے مقام پر اعتماد سے کھڑا ہوں، ورنہ اگر وہ چاہتیں تو میری ہستی کو ریزہ ریزہ بھی کر سکتی تھیں اور پھر عورت ہر روپ میں میرے لئے قابلِ احترام رہی ہے۔ سر اٹھا کر بیٹے پر حکمرانی اک ماں کا حق ہے اور میں اسے دل سے تسلیم کرتا ہوں، اسی طرح بہنوں کے حقوق سے بھی نظریں نہیں چرا سکتا، اور رہی بیوی تو اس کے سارے حقوق، سارے مان اور تھوڑا زعم، محبتوں کے ساتھ پوری ایمانداری سے قبول کروں گا۔

اور تمھارے ساتھ جو سانحہ ہوا۔ اس کا مجھے دلی افسوس ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اسے بھولنا یقیناً تمھارے اختیار میں نہیں ہوگا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اپنا دل بڑا کر لو، اور سوچوں کو نیا رخ دے کر اس انداز سے سوچ لو کہ ماں جی نے جو بھی کیا۔ اس طرح کبھی نہیں چاہا ہوگا۔ ان کا خیال ہوگا، تمھارے ابو جی اسی وقت رشتہ ختم کر دیں گے۔ جیسا کہ پہلے کئی جگہ ایسا ہوا پھر بھی بخدا اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ اس روز ماں جی تمھارے گھر اس مقصد کے لئے جا رہی ہیں تو میں انہیں روک لیتا۔ میری بہن تم سے سخت شرمندہ ہے اور یقیناً ایک دن ماں جی بھی ہوں گی۔ میں اس دن کا انتظار تو کر سکتا ہوں، لیکن انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ کہ وہ ابھی اشک ندامت لے کر تمھارے در پر جا کھڑی ہوں، اور تم ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرو۔ ان کی طرف سے میں خود تم سے دست بستہ معافی مانگتا ہوں۔

اگر ہو سکے تو ہم سب کو معاف کر دو۔ ورنہ اگر جان کے بدلے جان چاہتی ہو تو میں حاضر ہوں۔ ویسے بھی اب زندگی بے معنی سی لگنے لگی ہے۔ ہاں زارا! یہ اعتراف تو کر ہی لینے دو کہ دل و نظر میں سمانے والی تم پہلی اور آخری لڑکی ہو۔

ہر دو صورتوں میں تمھارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ مجھے ہر الزام سے بری کرتے

ہوئے معافی کی نوید یا ایک عمر کی خلش۔

آذر"

"آذر!"

ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ اس نے بیڈ کی پٹی پر سر ٹکا دیا۔

کچھ دیر بعد اسماء کمرے میں آئی تو وہ گم صم سی بیٹھی تھی۔

"زارا! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے ناں۔" اسے یوں گم صم دیکھ کر اسماء نے پریشانی سے پوچھا، تو اس نے آذر کا خط اس کی طرف بڑھا دیا، جسے اس کے ہاتھ سے لیتے ہی اسماء جلدی جلدی پڑھنے لگی۔

"مجھے پہلے ہی یقین تھا۔ آذر بھائی کبھی ایسے نہیں ہو سکتے۔" اسماء کو موقع مل گیا۔ اس کے سامنے گرنے کے انداز میں بیٹھتی ہوئی، قدرے جوش سے بولی تو وہ بے حد خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا تمھیں اب بھی ان کا یقین نہیں آیا؟"

"پتا نہیں۔"

"تم پتا کرو۔ میں جب تک یہ خط امی کو دکھا دوں۔" اسماء خط لے کر تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ تو وہ پھر سوچوں کے بھنور میں غوطے کھانے لگی۔

پھر سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ بہتر فیصلہ کر سکے گی۔ لیکن جب دو دن گزر گئے اور اس نے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی تو سب اسے سمجھانے لگے۔

"زارا! کیا یہ آذر بھائی کی بڑائی نہیں ہے کہ انہوں نے کبھی ہمیں جب وہ ہمارے گھر آ کر بہت اپنائیت سے ہمارے درمیان بیٹھا کرتے تھے، نہیں بتایا کہ ماں جی ان کی سگی ماں نہیں ہیں۔" اسماء قائل کرنے لگی۔

"اور وہ تو اب بھی یہ جاننے کے باوجود کہ ماں جی ان کے ساتھ دل سے فیئر نہیں

رہیں۔انہیں وہی احترام دے رہے ہیں۔'' شوبی کہنے لگا۔

''ان کی جگہ کوئی اور ہوتا، بلکہ اگر میں ہی ہوتا تو اسی وقت اس عورت کو چھوڑ دیتا۔''

''شوبی ٹھیک کہہ رہا ہے۔اتنا بڑا ظرف کسی کسی میں ہی ہوتا ہے۔اگر دیکھا جائے تو ماں جی ان کی زندگی سے کھیل رہی تھیں، پھر بھی آذر بھائی نے نظر انداز کر دیا۔تم بھی زارا پلیز انہیں معاف کر دو۔اگر انہیں نہیں تو آذر بھائی کو تو معاف کر دو۔''

''آذر نے کیا کیا ہے جو میں اسے معاف کر دوں۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''یہی بات آذر بھائی سے کہہ دو ناں۔پلیز زارا!''

اسماء کے منت بھرے لہجے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تو اسماء نے مطمئن ہو کر نومی اور شوبی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آگے آذر بھائی خود اس سے بات کر لیں گے۔

اگلے دن وہ اپنا استعفیٰ لے کر آفس گئی تو سیدھی آذر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔اسے شاید اس کے آنے کی امید نہیں تھی۔حیرت اور غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھا، اور پتا نہیں ارادتاً یا غیر ارادی طور پر فوراً کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ؟'' فقط اتنا کہہ سکا، اور اس ایک لفظ نے اجنبیت کی جو دیوار کھڑی کر دی تھی، اسے وہ فوراً نہیں پھلانگ سکتی تھی۔

''جی وہ۔میں یہ۔'' اس نے گڑبڑا کر لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔جسے لے کر وہ یونہی کھڑے کھڑے کھول کر دیکھنے لگا۔

''آپ بیٹھیں پلیز۔'' وہ بیٹھ گئی تو پوچھنے لگا۔

''جاب کیوں چھوڑ رہی ہیں؟'' اس نے جواب نہیں دیا تو کہنے لگا۔

''میری وجہ سے؟''

''نہیں تو۔''

''پھر کیا وجہ ہے؟''

''وجہ بتانا ضروری ہے کیا؟''

''اگر آپ نہیں بتانا چاہتیں تو میں مجبور نہیں کر سکتا۔''

اس نے تو بات ہی ختم کر دی تھی۔وہ کچھ دیر تک اسے فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے دیکھتی رہی، پھر بے اختیار پکار بیٹھی۔

''آذر۔'' وہ سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔کچھ پریشان سی اپنے آپ میں الجھتی ہوئی اچھی لگ رہی تھی۔

''کچھ پریشان ہیں۔'' اس کے پوچھنے پر اعتراف کیا۔

''ہاں۔'' وہ فائل بند کر کے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آئی ایم سوری۔میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اپنی پریشانی کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیجئے، کیونکہ آپ تو صرف اپنوں کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کیا کرتی ہیں۔''

''اس وقت بھی میں کسی غیر کے سامنے نہیں بیٹھی۔'' وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

''زارا!''

''ہاں آذر۔'' اس کی آنکھوں میں اچانک ڈھیر سارا پانی اتر آیا۔

''اس روز میں نے آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا، مجھے...''

''وہ ایک فطری عمل تھا۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔

''یقین کریں۔میں نے قطعی برا نہیں مانا تھا۔''

''یہ آپ کا ظرف ہے ورنہ آپ کی جگہ میں ہوتی تو.....'' وہ خاموش ہو گئی اور وہ ہنس پڑا۔

''کیا کرتیں آپ؟''

''آپ کو شوٹ کر دیتی۔''

''تو کیا اب شوٹ نہیں کریں گی۔''

''نہیں۔اب تو میں معافی کی نوید لے کر آئی ہوں۔سب کے لئے۔اور میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤں گی۔کیونکہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔لیکن یہ کوشش ضرور کروں گی کہ جو ہوا اسے خدا کی رضا جان کر قبول کرلوں۔''

''شکریہ زارا! پتا نہیں آپ کا بوجھ ہلکا ہوا یا نہیں، میرے دل کا بوجھ ضرور ہلکا ہو گیا ہے۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

'' آپ کی اس بات سے کہ آپ کسی غیر کے سامنے نہیں بیٹھیں۔میں یہ بات کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ میں ماں جی اور بہنوں کو نہیں چھوڑ سکتا، اور نہ کبھی چھوڑوں گا۔لیکن آپ کے لئے شرعی احکام کے مطابق الگ گھر۔''

''نہیں آذر!'' وہ فوراً بول پڑی۔

''جب عام معافی کا اعلان کر دیا تو پھر یہ تفریق کیوں۔میں ماں جی کے ساتھ رہوں گی، ورنہ ان کے خوف کو یقین مل جائے گا کہ ایک لڑکی ان سے ان کا بیٹا چھین رہی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب میں چلوں گی۔''

''میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔مجھے ماں جی کو بھی لینا ہے۔''

''کہاں سے؟''

''تمھارے گھر سے۔'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

''کیا مطلب؟''

''بھئی ماں جی اس وقت تمھارے گھر گئی ہوئی ہیں۔تمھاری امی سے یہ پوچھنے کہ لوگ جو شادی کارڈ پر کسی نئی تاریخ کا انتظار کر رہے ہیں۔تو کون سی تاریخ کا اعلان کیا جائے۔''

''کیا...؟'' حیرت سے منہ کے ساتھ آنکھیں بھی پوری کھل گئیں۔

''خاتونِ اول! آپ پلکوں کو تھوڑا سا جھکا لیجئے۔ہو سکتا ہے کل ہی کی تاریخ ہو۔''

''بے ایمان۔!'' اس نے شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ رخ موڑ لیا۔

☆☆☆

ہارے بھی تو بازی مات نہیں

وہ پچھلے دو گھنٹوں سے گل کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی مسلسل بحث کیے جا رہی تھی اور گل بھی کہاں ہار ماننے والی تھی' دونوں اپنے اپنے موقف پر اس طرح ڈٹی ہوئی تھیں جیسے میدان جنگ میں سپاہی اپنے مورچوں پر ڈٹ جاتے ہیں۔

ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش میں اب تو ان کی آوازیں اتنی اونچی ہو گئی تھیں کہ اندر تک سنی جا رہی تھیں۔ اصل میں ابتداء ہی میں کسی بات پر اس نے کہہ دیا تھا کہ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ اس پر گل نے فوراً اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

''غلط کہہ رہی ہو تم' محبت ہو نہیں جاتی بلکہ کی جاتی ہے۔''

''نہیں گل' یہ ہی ایک ایسا جذبہ ہے جس کے لیے باقاعدہ کسی پلاننگ کی ضرورت نہیں پڑتی' یہ تو کسی بھی لمحے اچانک دل کے نہاں خانوں سے کسی چشمے کی مانند پھوٹ نکلتا ہے۔'' وہ جانے کس خیال میں کھو کر بولی لیکن گل نے اس کا مذاق اڑایا۔

''تمہاری بات ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو یہ یہ احمد جو دل ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں

اور اپنے آپ کو مجنوں، فرہاد وغیرہ کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔''

''نہیں گل! ہر انسان کی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب اچانک کوئی ان دیکھا شخص پہلی ہی نظر میں دل کے تاروں کو یوں چھیڑ جاتا ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود دامن دل کو بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''سچ کہنا جو جی، تمہارا وہ فضول سا منگیتر تمہیں پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا؟'' گل ہنستے ہوئے پوچھا تو اسے سچ مچ غصہ آ گیا۔

''دیکھو گل، بات تمہارے اور میرے درمیان ہو رہی ہے، تم خواہ مخواہ بابر کی ذات نشانہ مت بناؤ۔''

''میرا مقصد بابر کو نشانہ بنانا نہیں تھا، میں تو صرف یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ کیا وہ تمہیں پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔''

''ہاں۔'' اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا تو گل فوراً کہنے لگی۔

''اب دیکھو ناں، اگر تم ذرا سی پلاننگ کر لیتیں تو یقیناً کوئی خوبصورت سا بندہ تمہارا طلب گار بن جاتا۔''

''اس کا مطلب ہے تم محبت کے لیے باقاعدہ پلاننگ کرو گی؟'' اس نے بھی فوراً گل کی بات پکڑی۔

''بالکل۔'' گل نے یقین سے گردن اکڑائی۔

''میں جب جس سے چاہوں گی محبت کروں گی۔''

''اور اگر تم پہلی ہی نظر میں اسیر محبت ہو گئیں تب.....؟''

''ایسا ناممکن ہے۔'' گل نے مضبوطی سے کہا۔

''میں اسے ناممکن نہیں سمجھتی، ہو سکتا ہے یہاں سے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے تمہارے ساتھ کوئی خوشگوار واقعہ پیش آ جائے اور تمہارے سارے دعوے اور دلیلیں دھری کی دھری

رہ جائیں۔''

''کیا بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو جو جی، اب میں اتنی بھی کمزور نہیں ہوں۔''

''بات کمزوری کی نہیں ہے گل، اصل قصہ یہ ہے کہ.....''

''بس جو جی، اب ختم کرو اس قصے کو۔'' گل نے اکتا کر ٹوک دیا اور اٹھنے لگی کہ اس نے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ پھر کہنے لگی۔

''پچھلے دو گھنٹوں سے ہم مغز ماری کر رہے ہیں، اس کا کوئی نتیجہ تو نکلنا چاہیے۔ تم میری بات سے اتفاق کر لو یا پھر مجھے قائل کرو۔''

''تم قائل ہونا نہ چاہو جو یریہ احمد تو دوسری بات ہے ورنہ دوسروں سے قطع نظر اپنے بارے میں، میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ میں خواہ مخواہ محبت ہو جانے اور پہلی نظر کی محبت پر یقین نہیں رکھتی۔'' گل کی ہٹ دھرمی پر وہ اندر ہی اندر جھنجھلا کر بولی۔

''اور اگر کبھی تمہارے ساتھ ایسا حادثہ ہو گیا تب.....؟''

''میں اسے محض حادثہ سمجھ کر اگنور کر دوں گی۔''

''شرط لگا لو گل، تم ایسے کسی خوبصورت حادثے کو اگنور نہیں کر سکتیں۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے ایسے چھوٹے چھوٹے حادثات بعض اوقات زندگی کا روگ بن جاتے ہیں۔''

''بن جاتے ہوں گے لیکن میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔'' گل نے کندھے اچکا کر لاپرواہی سے کہا تو وہ گہری سانس کھینچ کر لان کی طرف دیکھنے لگی جہاں منو بھائی پودوں کو پانی دے رہے تھے۔ اچانک ہی اس کی آنکھیں کسی خیال کے تحت چمکنے لگیں اور قدرے توقف سے وہ گل کے بازو پر دباؤ ڈالتی ہوئی بولی۔

''سنو گل، ہم دونوں کی اسی بات پر ہو جائے شرط، فیصلہ وقت کرے گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' گل نے بے نیازی سے کہا تو وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔

''اگر تم شرط ہار گئیں تو تمہیں منو بھائی سے شادی کرنی ہوگی۔''

''اور اگر میں جیت گئی تب.....!'' گل نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''تب اپنے حسین منگیتر کو چھوڑ کر منو بھائی سے شادی تمہیں کرنی پڑے گی۔'' گل نے کہا تو ایک لمحہ کو وہ نہ صرف سٹپٹائی بلکہ جھرجھری بھی لی لیکن کیونکہ شرط اس کی طرف سے لگائی گئی تھی اس لیے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں اثبات میں سر ہلایا تو گل زور سے ہنس پڑی۔

''اتنا بودا اقرار مت کرو جوجی۔''

''کیا مطلب؟'' اب واقعی وہ سٹپٹائی۔

''بھئی شرط لگا رہی ہو تو ذرا دل بڑا رکھو لوگ تو شرطوں میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں اور تم ابھی سے ہمت ہارے دے رہی ہو۔''

''میں کیوں ہمت ہارنے لگی جب کہ مجھے اپنے جیتنے کا سو فیصد یقین ہے۔'' اتنے یقین کے باوجود جانے کیوں اسے اپنی آواز دور سے آتی ہوئی لگی۔ اور گل نے اسی طرح ہنستے ہوئے بڑے جوش کا مظاہرہ کیا۔ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتی ہوئی بولی۔

''ایسا اعتراف کرو جیسا میں کر رہی ہوں کہ اگر کبھی میں پہلی نظر میں محبت کر بیٹھی یا بٹا پلاننگ کے اچانک کوئی شخص میری نگاہوں میں آن سمایا تو میں سمجھوں گی کہ میں شرط ہار گئی اور اس کے لیے جو سزا تم نے منتخب کی ہے اسے بخوشی قبول کر لوں گی۔'' اپنی بات ختم کر کے گل کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کا ہاتھ ہلا کر بولی۔

''اب تم کہو۔''

''اگر میں شرط ہار گئی تو بابر کو چھوڑ کر منو بھائی سے شادی کر لوں گی۔''

''یہ ہوئی ناں بات۔'' گل زور زور سے اس کا ہاتھ ہلانے لگی اور بالکل غیر ارادی طور

پر دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ہٹ کر منو بھائی پر جا ٹھہریں۔ اور اس کی طرح لمحہ بھر کو ہی گل کا دل بھی کانپا جب ہی وہ فوراً اٹھتی ہوئی بولی۔

''چلو اندر چلتے ہیں۔'' اور وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ اور گل بچپن کی ساتھی تھیں۔ اس وقت جب اس نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا تب ممی کی انگلی تھام کر گیٹ سے باہر نکلتی تو گل اپنی ممی کے ساتھ اپنے گیٹ پر موجود ہوتی تھی۔ پھر ممی تو اپنی باتوں میں مصروف ہو جاتیں اور وہ اور گل اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کبھی ایک دوسرے کا فراک چھو کر دیکھتیں، کبھی ربن اور کبھی ناک۔

شروع شروع میں بس ایک دوسرے کو چھونے پر اکتفا کرتیں پھر رفتہ رفتہ ہاتھوں میں پکڑی چاکلیٹ کا تبادلہ ہونے لگا۔ اور اب تو سچ مچ ایک دوسرے پر جان دینے کی باتیں ہوتی تھیں گو کہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں اور سبجیکٹ بھی ایک ہی تھے اس کے باوجود شام میں دو تین گھنٹے آرام سے بیٹھ کر جب تک ڈھیر ساری باتیں نہ کر لیتیں انہیں چین نہیں آتا تھا۔ گل اپنے گھر میں سب سے چھوٹی تھی اس سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن، تینوں شادی شدہ تھے، بڑے بھائی تو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہیں رہتے تھے، البتہ چھوٹے بھائی شادی کے چھ ماہ بعد بیوی کو لے کر الگ ہو گئے تھے، جب کہ بڑی باجی اپنے ماموں زاد سے بیاہی ہوئی تھیں اور پچھلے دو سال سے اپنے میاں کے ساتھ قطر میں مقیم تھیں۔

اس گھر میں منو بھائی بھی مقیم تھے جو گل کے تایا زاد تھے۔ ان کے والدین بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ اس کے بعد گل کے ڈیڈی انہیں اپنے پاس لے آئے۔ گو کہ گل کی ممی بہت اچھی خاتون تھیں، اس کے باوجود وہ منو بھائی کو وہ محبت نہیں دے سکیں جس کے وہ حق دار تھے۔ شروع ہی سے وہ نوکروں کے رحم و کرم پر رہے اور صحیح دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اکثر مختلف بیماریوں کا شکار رہتے دس سال کی عمر میں انہیں پولیو ہو گیا تھا اور کچھ لاپرواہی کی بنا پر وہ اب کچھ لنگڑا کر چلتے

تھے۔

شروع شروع میں جب وہ گل کے گھر جاتی تو منو بھائی کو دیکھ کر ڈر جاتی تھی۔ بے حد کمزور اور لاغر سے ایک بستر پر پڑے رہتے لیکن رفتہ رفتہ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسے کچھ کہیں گے نہیں تب دبے پاؤں ان کے پلنگ کے پاس سے گزرنے لگی اور منو بھائی نے کبھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جب بھی گل کے گھر جاتی وہ بس چپ چاپ اسے دیکھتے رہتے اور وہ ان کے دیکھنے کو نظر انداز کرتی ہوئی آرام سے گل کے ساتھ کھیلتی رہتی۔

یوں ہی ماہ و سال گزر گئے۔ وہ اور گل بچپن کی حدود سے بہت آگے نکل آئیں اور عمر کے اس سنہری دور میں بہاروں کے جانے کون کون سے روپ چرا لائی تھیں کہ دیکھنے والے محویت سے دیکھتے تھے اور بے نیازی ان کی عادت تھی۔ یا شاید دونوں ایک دوسرے میں اتنی مگن رہتی تھیں کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔

منو بھائی پرائیوٹ بی اے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور کیونکہ اس نے کبھی ان کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی اس لیے اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ پڑھتے اور امتحان دیتے کس طرح جاتے ہیں وہ بس اتنا جانتی تھی کہ وہ گل کے کزن ہیں۔ اور جس وقت وہ گل کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دنیا جہاں کی باتیں کرتی تو منو بھائی بیساکھی کے سہارے چلتے ہوئے ایک بار ضرور ان کے پاس سے گزرتے تھے۔ اگر وہ معذور نہ ہوتے تو شاید اپنی باتوں میں وہ کبھی دھیان ہی نہ دیتیں لیکن ان کی بیساکھی کی ٹک ٹک کچھ دیر کو انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے قریب سے گزرتے ہیں اس کے باوجود وہ زیادہ دھیان نہیں دیتی تھی۔

پھر اس وقت جب وہ انٹر کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی تو راولپنڈی سے بھیا کا بلاوا آ گیا اور وہ جانا بھی چاہتی تھی اور نہیں بھی' کیونکہ اس نے گل کے ساتھ کتنے پروگرام بنا رکھے تھے بس امتحان ختم ہونے کا انتظار تھا۔ اب اگر وہ چلی جاتی تو گل کی ناراضگی یقینی تھی اور وہ اسے ناراض

نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن بھیا اور بھابھی کو بھی منع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عجیب مشکل میں تھی کہ گل غالباً ممی کی زبانی سن کر اس کے پاس بھاگی چلی آئی۔

''تم پنڈی جا رہی ہو؟''

''نہیں تو۔'' وہ صاف مکر گئی۔

''جھوٹ مت بولو مجھے ابھی آنٹی نے بتایا ہے۔''

''کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ تمہیں بھیا اور بھابھی نے بلایا ہے۔''

''ہاں بلایا تو ہے لیکن میں نے ابھی جانے کے بارے میں نہیں سوچا۔'' اس نے قصداً بے نیازی دکھائی۔

''سوچنا بھی مت۔ اگر تم چلی گئیں تو میں یہاں کیا کروں گی۔'' گل نے باقاعدہ رعب جمایا تھا تو اچانک ہی ایک خیال سے وہ اچھل پڑی۔

''ہاں! یہاں تم کیا کرو گی چلو تم بھی میرے ساتھ چلو۔ دونوں چلتے ہیں ایمان سے بڑا مزہ آئے گا۔''

''لیکن میں کیسے جا سکتی ہوں؟''

''جیسے میں جاؤں گی۔''

''نہیں میرا مطلب ہے پتہ نہیں ممی اجازت دیں گی یا نہیں۔'' گل کے انداز میں آمادگی کے ساتھ اجازت نہ ملنے کا اندیشہ بھی تھا۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

''چلو آنٹی سے میں بات کرتی ہوں۔''

اور تھوڑی پس و پیش کے بعد گل کی ممی نے اجازت دے دی تو اسی وقت دونوں تیاری میں لگ گئیں۔ پھر اگلے روز ہی پاپا نے ان کی سیٹیں کرکنفرم کروا دیں۔ یوں اپنے بقیہ سارے پروگراموں کو آئندہ پر ٹال کر دونوں راولپنڈی آ گئیں۔

بھیا جانتے تھے کہ وہ دونوں گھومنے پھرنے کی کتنی شوقین ہیں اس لیے اپنی گاڑی ان کے حوالے کردی۔ ساتھ ہی سختی سے تاکید بھی کی تھی' ایک تو محتاط ڈرائیونگ کی دوسرے پنڈی سے آگے نہیں جانا اور ابھی وہ اتنی بڑی نہیں ہوئی تھیں کہ بھیا کی تاکید نظرانداز کردیتیں۔

پھر چھٹی والے دن بھیا اور بھابھی خود ہی انہیں مری لے گئے۔ موسم کی جولانیاں عروج پر تھیں۔ وہ گل کا ہاتھ تھام کر اونچے اونچے پہاڑوں پر بادلوں کے سنگ چلتی ہوئی بہت دور نکل گئی' بھیا پیچھے سے پکارتے رہ گئے لیکن جب وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن ہوتیں تو پھر کہاں کوئی آواز سنائی دیتی تھی۔ ایک پہاڑی سے نیچے اتریں تو ایک آدمی دو گھوڑے لیے کھڑا تھا۔ دونوں نے اشتیاق سے دیکھا تو وہ پوچھنے لگا۔

''بی بی سواری کرنی ہے؟'' تب ہی پیچھے سے بھیا اور بھابھی آگئے اور ان کا اشتیاق دیکھ کر بھیا فوراً کہنے لگے۔

''جوجی' بہت خطرناک سواری ہے پیچھے ہٹ جاؤ۔''

''نہیں بھیا! مجھے ڈر نہیں لگتا' ایک بار بیٹھنے دیں۔'' اس کے ساتھ ساتھ گل نے بھی ضد شروع کردی' تب بھابھی کی سفارش پر بھیا نے انہیں ان کی مرضی پر چھوڑ دیا' تو گل نے گھوڑے کی لگام تھامنے میں پہل کی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے بھیا کو دیکھا کہ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہیں لیکن انہوں نے مسکرا کر اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ کر دوسرے گھوڑے پر سوار ہوگئی اور ابھی کوچوان انہیں ہدایات دے ہی رہا تھا کہ جانے کیا ہوا اس کا گھوڑا ایک بار زور سے اچھلا اور پھر سرپٹ دوڑنا شروع کردیا۔ وہ پہلے تو خوب چیخی' غالباً موت سامنے نظر آنے لگی تھی' یوں لگ رہا تھا کسی بھی لمحے اچھل کر کسی کھائی میں جا گرے گی۔

بڑی مشکل سے اپنے حواسوں پر قابو پا کر اس نے اپنے دونوں بازو گھوڑے کی گردن میں مضبوطی سے جکڑ لیے۔ پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا کوئی مدد کے لیے بھی آرہا ہے یا نہیں ذرا سی

گردن موڑی تھی کہ اچانک اسے لگا وہ کہیں الجھ گئی ہے۔ گھوڑے کی گردن میں اس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پھر کسی مضبوط حصار میں جکڑی وہ نشیب میں لڑھکتی چلی گئی' خوف سے آنکھیں بند کیے پہلا خیال یہی آیا کہ اب وہ کبھی اپنے گھر والوں کو نہیں دیکھ سکے گی۔

کتنی دیر بعد احساس ہوا کہ وہ زندہ سلامت کسی مقام پر رک چکی ہے۔ تب ڈرتے ڈرتے ذرا سی آنکھیں کھول کر اس نے دیکھا اف اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں جکڑے وہ جانے کون تھا جو اپنی بے حد خوبصورت' تسخیر کر لینے والی آنکھوں میں کچھ حیرت' کچھ اشتیاق لیے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اور دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتی دھڑکنیں جانے کیا کہہ رہی تھیں کہ وہ بری طرح نروس ہوگئی۔ اور اس کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی تو وہ مسکرا کر بولا۔

''مجھے بابر کہتے ہیں۔'' پھر اسے چھوڑ کر کھڑا ہوا تو کہنے لگا۔ ''بابر نام کے لوگوں میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ کبھی مست ہاتھی کی زد میں آئے ہوئے بچے کی خاطر جان ہتھیلی پر رکھ لیتے ہیں اور کبھی کسی سرکش گھوڑے پر بیٹھی لڑکی کو بچاتے ہوئے خود زخمی ہو جاتے ہیں۔''

''آپ.....'' وہ ایسی ہی گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی' لیکن وہ کہیں سے بھی زخمی نظر نہیں آرہا تھا پھر بھی پوچھ لیا۔ ''آپ کو کہاں چوٹ لگی ہے؟''

''یہاں.....'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ تو سن کر اس نے فوراً گھوم کر دیکھا گل بھیا اور بھابھی انتہائی پریشانی کے عالم میں بھاگے چلے آرہے تھے وہ بھی بھاگ کر بھابھی سے لپٹ گئی اور رونا شروع کردیا۔

''ارے کیا ہوا' ٹھیک تو ہو ناں؟'' بھابھی آہستہ آہستہ اسے تھپکنے لگیں۔ گل اس کے بازو میں چٹکی کاٹتی ہوئی بولی۔

''جان نکال کر رکھ دی تم نے ہماری۔''

''سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' آنسو پونچھتے ہوئے اس نے سارا الزام گل کے سر رکھ دیا۔

''میری وجہ سے.....؟'' گل نے آنکھیں دکھائیں تو بھابھی ٹوکتی ہوئی بولیں۔

''بری بات! اب لڑو نہیں بلکہ شکر کرو کہ کوئی حادثہ نہیں ہوا۔''

''پہلے اس کا شکریہ ادا کریں' ہے کون وہ۔'' گل نے بابر کی طرف اشارہ کیا تو اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ بھیا اس سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ پھر قریب آ کر بولے۔

''بھئی بابر یہ نٹ کھٹ لڑکیاں بدقسمتی سے میری بہنیں ہیں۔''

''کیا؟'' دونوں احتجاجاً چیخ پڑیں۔ اور بھابھی نے بھی ان کی طرف داری کی تو بھیا کو تصحیح کرنی پڑی۔

''خوش قسمتی سے میری بہنیں ہیں۔'' پھر بھیا اس کے بارے میں بتانے لگے۔

''یہ بابر ہے' میرا بہت پرانا دوست..... اسکول' کالج اور یونیورسٹی تک ہم ساتھ پڑھے ہیں۔ پھر غم روزگار نے ہمیں جدا کر دیا۔ اور اب غالباً چار سال بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔ چلو بابر باقی باتیں گھر چل کر کریں گے۔''

''کہاں مقیم ہو؟'' وہ بھیا سے پوچھنے لگا۔

''میں گزشتہ دو سالوں سے پنڈی میں مقیم ہوں۔ تم کہاں ہوتے ہو؟''

''اتفاق سے میں بھی پنڈی میں ہوں' لیکن مجھے آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔''

''چلو پھر چلتے ہیں۔'' بھیا اسے لے کر آگے بڑھے تو ان تینوں نے بھی تقلید کی۔

یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سائے
مجھے گھیر لیتے ہیں بانہوں کے سائے

بھیا نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی کیسٹ آن کر دی تھی' اور وہ جو پہلے ہی خود کو اس کی نگاہوں کے حصار میں محسوس کر رہی تھی مزید نروس ہو کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ مناظر تو پہلے ہی حسین تھے اور اب تو جیسے ان کی دلکشی میں دوگنا اضافہ ہو گیا تھا۔

اور اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تب اسے پتہ چلا کہ نیندیں پرائی کب اور کیوں ہوتی ہیں اور وجود جب کسی کی خوبصورت نگاہوں کے حصار میں قید ہو جائے تو دھڑکنوں کا انداز کیسے بدل جاتا ہے۔ وہ رات بھر اپنی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی' اور پلکوں نے تو جیسے ایک دوسرے سے نہ ملنے کی قسم کھالی تھی۔ نیم تاریکی اور سناٹے میں مسلسل اس کی سرگوشی سنائی دیتی رہی۔ پھر اس کے بازوؤں کا مضبوط حصار! وہ کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی تھی۔

صبح گل نے پہلے حیرت سے اسے دیکھا' پھر شرارت سے پوچھا۔

''خیریت؟''

''کیوں کیا ہوا؟'' وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

''یعنی اب یہ بھی میں ہی بتاؤں۔''

''پتہ نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ نظریں چراتی ہوئی بولی تو گل نے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

''میری جان' تمہاری آنکھوں میں اتری گلابیاں بہت سی ان کہی داستانیں سنا رہی ہیں جن میں مجھے ایک نام بڑا واضح نظر آ رہا ہے اور وہ ہے بابر.....''

''بابر..... بابر.....'' اس کی دھڑکنیں سچ مچ راگ الاپنے لگی تھیں۔

''کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔'' گل نے اس کی ٹھوڑی چھو کر پوچھا۔

''نہیں' تم بھی غلط کہہ سکتی ہو بھلا۔'' پہلے ہی مرحلے پر اعتراف کرتے ہوئے وہ بری طرح جھینپ گئی اور گل کو اسے ستانے کا موقع مل گیا تھا۔ سارا دن لمبی لمبی آہیں بھرتی رہتی کبھی ذو معنی جملے اور کبھی ''مجھے نیند نہ آئے'' جیسے گانے گاتی رہی وہ سخت پزل ہو رہی تھی۔ کتنی بار روٹھی بھی لیکن گل نے منالیا۔

اور شام میں جب وہ آیا تو اس کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ بے قراریاں اس کے

انگ انگ سے عیاں ہو رہی تھیں۔ بھیا اور بھابھی سے باتیں کرتے ہوئے متلاشی نظریں مسلسل اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ گل کتنی دیر تک نوٹ کرتی رہی۔ پھر اس کے پاس آ کر بولی۔

''وہ تمہارے لیے آیا ہے اور تم یہاں بیٹھی ہو۔''

''تمہیں کس نے کہا کہ وہ میرے لیے آیا ہے۔'' وہ قصداً انجان بن گئی۔

''اس کی ہر ادا بتا رہی ہے' ہمیں تو لفٹ ہی نہیں کرا رہا۔''

''اچھا۔'' وہ ہنس پڑی۔

''یہ بتیسی بعد میں نکالنا' پہلے اس بے چارے کو اپنا دیدار کرا دو۔''

''نہیں' میں نہیں جاؤں گی۔'' اس پر گھبراہٹ سوار ہو گئی۔

''ارے واہ کیسے نہیں جاؤ گی۔'' گل اس کا ہاتھ پکڑ کر باقاعدہ کھینچتی ہوئی لاؤنج میں آئی تو اس کے مایوس چہرے پر ایسی چمک لہرائی تھی کہ گل بھی حیران ہو کر دیکھے گئی' پھر اس سے سرگوشی میں بولی۔

''دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی ہے۔''

''تم کہاں تھیں جوجی' چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' بھابھی نے ٹوکا تو وہ جلدی سے ان کے پاس بیٹھ گئی اور اس سے زیادہ اسے گل کی شوخ و معنی خیز نظریں پریشان کر رہی تھیں۔ کم بخت کو ذرا احساس نہیں تھا اس نے سوچ لیا کہ آئندہ اسے کوئی بات نہیں بتائے گی۔

پھر روزانہ ہی اس کی آمد ہونے لگی' اور وہ تو پہلے مقام پر ہار چکی تھی۔ زیادہ ون گریز بھی نہیں کر سکی۔ پھر بھیا بھابھی کی طرف سے بھی ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ بڑے آرام سے سرِ شام لان میں آ کر اس کا انتظار کرتی اور وہ بھی سیدھا اسی کے پاس چلا آتا۔ گو کہ بہت سیدھے سادے انداز میں رسمی باتیں ہوتیں لیکن اس سے اس کی آنکھوں میں جو رنگ اترتے تھے انہیں وہ اپنے چہرے پر محسوس کرتی تھی۔ ایسے میں اگر گل آ جاتی تو دونوں کو دیکھ کر شوخی سے ہنسنے سے باز نہیں آتی تھی۔ پھر ابھی جذبوں کو زبان نہیں ملی تھی کہ کراچی سے ان دونوں کا بلاوا آ گیا۔ اتفاق سے اس

وقت وہ اس سے یہی پوچھ رہا تھا کہ اس کا یہاں قیام کب تک ہے کہ گل آ کر کہنے لگی۔

''سنو جوجی' ابھی تمہارے پاپا کا فون آیا تھا اور انہوں نے ہمیں واپس آنے کو کہا ہے۔'' وہ گل کی بات سن کر اسے دیکھنے لگی اور جیسے اسے اپنی بات کا جواب مل گیا تھا کچھ خاموش سا ہو کر دور آسمانوں پر نظریں دوڑانے لگا اور گل کو پتہ نہیں کوئی کام تھا یا قصداً انہیں تنہا چھوڑ کر اندر چلی گئی' تو قدرے توقف سے وہ جیسے اپنے آپ سے بولا

''تو تم جا رہی ہو؟''

''ہاں۔'' وہ خواہ مخواہ ہنسی تو جو باتیں اتنے دنوں سے نہیں کہی جا سکی تھیں وہ اچانک ہونٹوں پر آ گئیں۔

''تم مجھے بہت یاد آؤ گی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تم نہ جاؤ۔''

''جانا تو ہے۔'' معاً اس سے دوری کے خیال سے وہ افسردہ ہو گئی' تو کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

''میں چاہتا ہوں جویریہ جب تم یہاں سے جاؤ تو صرف میرا تصور ہی نہیں میرا تحفظ بھی ساتھ لے جاؤ۔''

''جی۔'' وہ نہیں سمجھی۔ تو وہ سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔

''میں تمہارے بھیا اور بھابھی سے بات کرنا چاہتا ہوں تمہارے لیے۔'' وہ خاصی نروس ہو کر سر جھکا گئی۔

''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' وہ اس کے نروس ہونے پر محظوظ ہو کر پوچھ رہا تھا کہ گل نے آ کر شور مچا دیا۔

''ہرگز نہیں' ہرگز نہیں۔'' وہ سٹپٹا کر کھڑی ہو گئی اور گل کو گھورنے لگی جب کہ وہ اسی محظوظ انداز میں گل سے مخاطب ہوا۔

''تو آپ چوری چوری دوسروں کی باتیں بھی سنتی ہیں۔''

''سب کی تو نہیں صرف آپ کی۔'' گل نے بھی مزے سے جواب دیا۔

''صرف میری کیوں؟''

''اس لیے کہ معاملہ میری عزیز از جان دوست کا ہے۔''

''عزیز از جان دوست۔'' اس نے دہراتے ہوئے اسے دیکھا پھر گل سے پوچھ لگا۔ ''پھر آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتی ہوں۔''

''ظالم سماج سے ٹکرا سکتی ہوں' ویسے آپ بے فکر رہیں میرا خیال ہے آپ دونوں کے درمیان اس قسم کی کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔''

''اچھا.....'' گل کی بے ساختہ ہنسی میں اس کی ہنسی بھی شامل ہو گئی تو اسے وہاں سے بھاگنے میں عافیت نظر آئی۔

پھر اگلے روز واپس آتے ہوئے اسے لگا وہ بہت کچھ یہیں چھوڑے جا رہی ہے اور بہت کچھ اس کے ساتھ ہے۔ یعنی گھاٹے کا سودا نہیں تھا اور اس کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی ایک پل کو اداس تو دوسرے پل ہونٹ مسکرانے لگتے۔

سارا دن ممی اس سے بھیا اور بھابھی کا حال احوال پوچھنے کے ساتھ ان ہی کی باتیں کرتی رہیں۔ شام میں وہ حسبِ عادت گل کے گھر چلی آئی تو اس روز پہلی بار منو بھائی نے اسے خود سے مخاطب کر کے پوچھا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''بہت اچھی۔'' وہ انہیں سرسری انداز میں جواب دے کر یا دوسرے لفظوں میں نظرانداز کر کے اندر چلی آئی۔ گل خلاف عادت کچن میں نظر آئی تو اس نے برملا حیرت کا اظہار کیا۔

''یعنی تم اور یہاں۔'' جواب میں وہ ڈھٹائی سے ہنسی۔

''کبھی کبھی ایسا حسنِ اتفاق بھی ہو جاتا ہے۔'' گل نے مسکرا کر کہا۔

''کبھی کبھی کیوں روزانہ ہو تو بات بھی بنے' ویسے کیا بنا رہی ہو؟''

''فرنچ ٹوسٹ بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''کوشش.....'' وہ ہنستی ہوئی اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگی۔ تو قدرے توقف سے گل معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''یہ میں خاص تمہارے لیے بنا رہی ہوں۔''

''اس مہربانی کا سبب پوچھ سکتی ہوں؟''

''ہاں' میں نے سوچا اب تم پرائی ہونے والی ہو تو یہ جو کچھ وقت کا ساتھ ہے کیوں نہ تمہاری خاطر مدارات کر لوں بعد میں یاد کرو گی۔'' گل نے فرائی پین میں گھی ڈالتے ہوئے سبب بتایا تو وہ جھینپ کر بولی۔

''ہٹو بے ایمان۔''

''بے ایمانی کی کیا بات ہے سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے بابر صاحب آجکل میں تمہارے پیچھے بھاگے آئیں گے۔''

''مجھے ایسا کچھ نہیں لگتا۔'' وہ یوں ہی اٹھ کر ریک کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''اے.....! ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو۔'' گل نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف موڑا تو کچھ حیران سی ہو گئی۔ دھنک رنگوں کی برسات میں بھیگا اس کا چہرہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہا تھا۔

پھر گل کا کہنا سچ ثابت ہوا۔ کچھ دنوں بعد ہی بھیا' بھابھی کے ساتھ بابر اپنے ڈیڈی کو لے کر آ گیا اور کیونکہ بھیا اس کی پرزور سفارش کر رہے تھے اس لیے ممی اور پاپا نے انکار نہیں کیا اور اگلے ہی دن بہت سادگی سے بابر نے اس کی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنا دی۔

پاپا ابھی اس کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ابھی اس نے صرف انٹر کیا تھا۔ خود اسے بھی پڑھنے کا شوق تھا اس لیے اس کے کم از کم بی اے کر لینے تک پاپا نے شادی کا کوئی ارادہ

ظاہر نہیں کیا بلکہ صاف لفظوں میں بابر کے ڈیڈی کو بھی بتا دیا اور اس نے سنا تو سیدھا اس کے پاس چلا آیا تھا۔

''یہ سراسر زیادتی ہے۔''

''کیا مطلب.....؟'' وہ اس کے آنے پر ہی بوکھلا گئی تھی اس کی بات کیا سمجھتی۔

''میرا خیال تھا میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔'' اور اس بار وہ اس کی بات سمجھ کر رخ موڑ گئی کیونکہ دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

''سنو۔'' وہ قدم بڑھا کر سامنے چلا آیا۔ ''دو سال بہت ہوتے ہیں' ایسا کرو بعد میں پڑھ لینا۔''

''بعد میں یہ صرف بچوں کی نگہداشت پر کتابیں پڑھ سکے گی۔'' گل اندر آتی ہوئی بولی تو وہ پہلے سٹپٹایا پھر وانت پیس کر بولا تھا۔

''یہ آپ کہاں سے نازل ہو جاتی ہیں۔''

''میری چھٹی حس الارم بجاتی ہے کہ میری دوست کسی مشکل میں گرفتار ہے۔ بس میں فوراً اس کی مدد کو پہنچ جاتی ہوں۔'' گل نے گردن اکڑا کر کہا تو وہ گہری سانس کھینچ کر گرنے کے انداز میں وہیں صوفے پر ڈھے گیا۔ پھر جیسے اچانک یاد آنے پر کہنے لگا۔

''سنیں گل' آپ نے تو کہا تھا کہ آپ ہماری خاطر ظالم سماج سے ٹکرا سکتی ہیں۔''

''کہاں ہے ظالم سماج! جلدی بتائیں۔'' وہ بالکل سنجیدہ نہیں ہو رہی تھی تب وہ اس کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''آپ کی دوست ہی ظالم بنی ہوئی ہیں۔''

''میں نہیں مانتی۔ یہ سب کچھ ہو سکتی ہے' ظالم نہیں' ویسے کیا ظلم کیا ہے اس نے۔''

''آنرز کرنا چاہتی ہیں۔'' اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

''یہ ظلم تو نہیں ہے۔''

''آپ سے بات کرنا فضول ہے۔'' وہ مایوسی سے سر ہلاتا ہوا اُٹھ کر چلا گیا تو گل نے اسے دیکھ کر ''کیا ہوا'' کا اشارہ کیا اور وہ بے بسی سے بولی۔

''مجھے نہیں پتہ۔''

اب بھلا وہ کیا کر سکتی تھی جب ممی اور پاپا ہی اس کی شادی کے حق میں نہیں تھے' خود سے تو کہنے سے رہی اور اس کی خفگی بھی جان پر بنائے دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے منایا۔

یوں ہی کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ منگنی کے چوتھے روز بابر واپس چلا گیا تھا اور اب اس سے صرف فون پر بات ہوتی تھی۔ اس کے اور گل کے معمولات وہی تھے۔ صبح ساتھ یونیورسٹی جانا ساتھ واپس آنا اور پھر شام میں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کرنا' کبھی فیورٹ اسٹارز' کبھی کھلاڑیوں کی باتیں اور کبھی یوں ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر شرطیں لگانا۔

ان کی شرطیں بھی بہت معمولی ہوتی تھیں یعنی جو ہارتا وہ جیتنے والے کو کوک پلاتا یا آئسکریم کھلاتا' لیکن اس بار شرط کڑی ہو گئی تھی۔ گو کہ اس شرط میں پہل اس کی طرف سے ہوئی تھی پھر بھی اسے لگا جیسے گل نے اس کی شہ رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہو۔ بابر سے دور ہو جانے کا تصور ہی اس کے لیے سوہان روح تھا جب کہ شرط ہارنے کی صورت میں اس سے دستبردار ہونا۔

اس رات وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتی رہی۔ کبھی خود سے الجھتی کہ آخر اسے ایسی شرط لگانے کی کیا ضرورت تھی اور کبھی خود کو بہلاتی کہ اسے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے گل یقیناً ہار جائے گی۔ اور ہار جیت کا فیصلہ تو وقت کو کرنا تھا۔

لیکن وہ ڈسٹرب ضرور ہو گئی تھی۔ خواہ مخواہ کے واہمے' اندیشے جن میں گھر کر وہ ہر وقت ہر جگہ گل کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ یونیورسٹی میں کسی بھی لڑکے سے بات کر رہی ہوتی' اس کی نظریں مسلسل اس کا جائزہ لینے میں لگ جاتیں۔ حقیقتاً وہ کسی ایسی بات کی منتظر تھی جو اسے گل کے ہارنے کی نوید دے اور پھر وہ اس اطمینان سے جی سکے کہ بابر کو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

دوسری بات جو اس کے لیے پریشانی کا باعث تھی کہ اس روز کے بعد سے ارادی یا غیر ارادی طور پر اس کی نظریں منو بھائی کے آس پاس بھٹکنے لگتیں' پہلے جب وہ اس کے قریب سے گزر کر جاتے تھے تو وہ بالکل نظر انداز کر دیتی تھی' اب ایسا لگتا جیسے اس کے کان ان کی بیساکھی کی ٹک ٹک سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ اس وقت تک وہ گل کی کوئی بات دھیان سے نہیں سن پاتی تھی جب تک منو بھائی ٹک ٹک کرتے قریب سے گزر نہ جاتے۔ پھر اپنی نظروں کو ان کے پیچھے بھٹکتا چھوڑ کر وہ گل سے باتوں میں مصروف ہو جاتی۔

☆☆☆

رات خوب بارش ہوئی تھی اور ابھی بھی آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے تھے۔ ناشتے کے بعد وہ ٹیرس پر آ کر بارش کے بعد نکھار دیکھنے لگی' ہر شے دھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر اس نے لان پر نظر ڈالی۔ پھولوں پر ٹوٹ کر نکھار آیا تھا۔ تازہ ہوا میں اس نے لمبے لمبے سانس لیے پھر گل کے گھر کی طرف دیکھنے لگی۔

چھٹی کا دن تھا اور اسے معلوم تھا کہ گل بارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھے گی اس نے سوچا وہ ہی جا کر اسے کہے اور اپنی سوچ پر عمل کی خاطر وہ ریلنگ چھوڑ کر ہٹی ہی تھی کہ قدم رک گئے۔ اس نے دیکھا گل برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہی تھی اور اس کے ساتھ جانے کون تھا اور کیا کہہ رہا تھا کہ گل کے ہونٹوں پر خوبصورت و شرمگیں مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

وہ نہ صرف ٹھٹھکی بلکہ اچانک دل کسی خیال سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ریلنگ کا سہارا لیتے ہوئے اسے حیرت بھی ہوئی کہ اتنی دور سے وہ اس کے چہرے پر پھیلے قوس قزح کے رنگ دیکھ رہی ہے۔ دل چاہا بھاگتی ہوئی اس کے سامنے جا کھڑی ہو اور کہے تم شرط ہار گئیں لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی اور قدرے توقف سے ایک شوخ سا گانا گنگناتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ ابھی آخری سیڑھی پر تھی کہ فون کی بیل جیسے اس کے ساتھ گنگنانے لگی۔ اس نے آ کر ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف بابر کی آواز سنتے ہی بے اختیار ہو کر بولی۔

''بابر کیسے ہیں آپ' کہاں رہے اتنے دن مجھے فون کیوں نہیں کیا؟'' اس کی کھنکتی آواز پر جہاں وہ ہنسا وہیں حیرت سے بولا۔

''آپ بھول رہی ہیں میڈیم ابھی پرسوں ہی میں نے فون کیا تھا۔''

''اوہ ہاں۔'' وہ خواہ مخواہ ہنس پڑی۔

''ایک بات بتاؤ جو جی' تم اتنے دن کہاں کھوئی رہیں۔'' وہ ابھی بھی حیران تھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ سمجھی نہیں۔

''بھئی اتنے دنوں بعد آج تمہاری اصلی آواز سننے کو ملی ہے۔'' اس نے کہا تو اسے یاد آیا کہ اتنے دنوں سے وہ خواہ مخواہ کے اندیشوں میں گھر کر کتنی پریشان رہی۔

''بس تھی ایک بات پھر کبھی بتاؤں گی۔''

''ابھی کیوں نہیں؟''

''بس ابھی نہیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی لیکن سنو' آئندہ خیال رکھنا۔ میرا مطلب ہے میں تمہاری ایسی ہی کھنکتی ہوئی آواز سننا چاہتا ہوں۔'' وہ ہنس پڑی۔

''خیال رکھوں گی اور کوئی حکم.....؟''

''حکم تو نہیں التجا کر سکتا ہوں کہ اب.....''

''اوں ہوں۔'' وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہے گا اس لیے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے فون بند کر دیا اور ممی سے کہہ کر گل کی طرف آ گئی۔ اس کا خیال تھا اسے دیکھتے ہی گل ابھی کچھ دیر پہلے پیش آنے والے خوبصورت حادثے کی بابت سب کچھ بتا دے گی لیکن وہ کوئی گھنٹہ بھر اس کے پاس بیٹھی رہی اور اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ تب خود سے الجھتی ہوئی وہ اس کے پاس سے اٹھ کر چلی آئی۔

اسے سچ مچ بہت دکھ ہو رہا تھا کہ گل نے ہار جانے کے ڈر سے نہیں بتایا یا کوئی اور بات

تھی۔ بہر حال اس نے بھی سوچ لیا کہ وہ خود سے نہیں پوچھے گی۔ اور بہت سارے دن منتظر بھی رہی لیکن گل نے کوئی بات نہیں کی۔

اس روز وہ اس کے گھر گئی تو پتہ چلا وہ کہیں گئی ہوئی ہے۔ وہ کھڑے کھڑے اس کی ممی سے بات کرکے واپس آرہی تھی کہ گیٹ پر منو بھائی کو دیکھ کر رک گئی۔ وہ کھڑے بھی تو اس انداز سے تھے جیسے راستہ روکے کھڑے ہوں۔ اسے دیکھ کر ایک طرف ہٹنے کی بجائے چند قدم بڑھ کر اس کے سامنے آگئے اور پوچھنے لگے۔

''آج آپ بہت جلدی واپس جارہی ہیں۔''

''ہاں، وہ گل نہیں ہے گھر پر۔'' وہ بولتے ہوئے کچھ رک گئی۔

''اور لوگ تو ہیں۔''

''جی، میں سب کو سلام کرآئی ہوں۔''

''اچھا۔'' وہ ذرا سا ہنسے۔ ''مجھے تو نہیں کیا سلام، یا آپ مجھے گھر والوں میں شمار نہیں کرتیں۔''

''یہ کیسے سمجھ لیا آپ نے؟''

''میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے، بات تو وہی سچ ہے جو میں نے کہی۔'' ان کا بظاہر ہلکا پھلکا انداز تھا لیکن آواز میں پنہاں دکھ وہ محسوس کرگئی۔ پھر بھی انجان بن کر بولی۔

''پتہ نہیں آپ کیسی باتیں کررہے ہیں ورنہ میں نے تو کبھی اس طرح نہیں سوچا۔''

''چلئے آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔''

''شکریہ۔'' وہ کہتی ہوئی آگے بڑھی۔ پھر اچانک کسی خیال کے تحت رک کر بولی۔ ''سنیں منو بھائی! آپ کو پتہ ہے گل کہاں گئی ہے؟''

''نہیں۔'' سیدھا سادا جواب تھا اور وہ قدرے طنز سے بولی۔

''کیوں کیا آپ اس گھر کے فرد نہیں ہیں۔'' ایک پل کو ان کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ پھر

سنبھلنے کی کوشش میں غالباً ناکام ہوکر وہ پلٹ کر اندر چلے گئے تو وہ کندھے اچکا کر باہر نکل آئی۔

ایگزام قریب آرہے تھے۔ اس لیے وہ اور گل دیگر مشاغل چھوڑ کر سنجیدگی سے تیاری میں لگ گئیں۔ ہر شام جتنی دیر وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر باتیں کرتی تھیں وہی وقت اسٹڈی کے لیے رکھ لیا اور برآمدے کی بجائے لان میں بیٹھنے لگیں۔ اگر ایسے میں منو بھائی پودوں کو پانی دے رہے ہوتے تو جانے کیوں وہ ان کی طرف سے پیٹھ موڑ لیتی۔

اس روز موسم بہت خوبصورت ہورہا تھا اور وہ دونوں کیونکہ جو پروگرام بناتیں اس پر سختی سے عمل بھی کرتی تھیں، اس لیے دل نہ چاہنے کے باوجود اپنے اپنے نوٹس لے کر لان میں آگئیں۔ یہاں گلابوں کی مہک کے ساتھ ہلکی ہلکی پھوار نے بھی ان کا استقبال کیا تو گل نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو ''کیا پروگرام ہے۔'' جواب میں وہ اپنی فائل کھول کر بیٹھ گئی۔

''بہت بد ذوق ہو تم۔'' گل بیٹھی ہوئی پرا سا منہ بنا کر بولی تو اس نے مسکراہٹ چھپانے کی خاطر سر جھکا لیا اور قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''ایسے موسم بار بار آتے ہیں، ہم کبھی بھی انجوائے کرسکتے ہیں۔''

''امتحان بھی تو بار بار آتے ہیں۔''

''بکومت میں ہرگز وقت ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں اور برائے مہربانی اب فضول باتوں سے پرہیز کرو۔'' وہ بہت سنجیدگی سے ڈانٹ کر پڑھنے میں مصروف ہوگئی تو کچھ دیر تک گل کی ہڑبڑاہٹ سنائی دیتی رہی پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ وہ یہی سمجھی وہ بھی پڑھنے لگ گئی ہے۔ کتنی دیر بعد یوں ہی سر اٹھا کر دیکھا تو چونک گئی۔ گل ایک ہتھیلی پر چہرہ ٹکائے جانے کیا سوچ رہی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں چاہتوں کے رنگ واضح طور پر نظر آرہے تھے۔

وہ پہلے حیران ہوئی پھر اچانک کسی خیال کے تحت ذرا سا مسکرائی اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتی ہوئی دھیرے سے بولی۔

''سنو گل! تم شرط ہار گئیں۔''

''کیا مطلب؟'' گل نے بری طرح چونک کر دیکھا تو وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی بولی۔

''مطلب کو چھوڑو، یہ بتاؤ کون ہے وہ خوش نصیب جس کے تصور میں کھو کر تم یہ بھی بھول گئیں کہ تمہارے سامنے میں بیٹھی ہوں۔''

''پتہ نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟'' گل نے پہلو تہی کی کوشش کی لیکن وہ اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کر کے ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو گل کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور اگر تمہیں یاد ہو تو میں نے بھی اس وقت ایسا ہی کیا تھا جب بابر میرے تصور میں آن بسا تھا اور یاد ہے جواب میں تم نے کیا کیا تھا۔''

''مجھے یاد ہے لیکن میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔'' گل نے نروٹھے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ اتنی سختی سے کہا کہ فوری طور پر وہ سمجھ نہیں سکی کہ آیا وہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ! کچھ دیر تک بغور اسے دیکھتی رہی۔ پھر یقین سے بولی۔

''دیکھو گل تمہارا اور میرا بچپن کا ساتھ ہے اور میرا خیال ہے ہم دونوں ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ اس وقت تم غلط بیانی سے کام لو تو دوسری بات ہے ورنہ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ محبتوں کی راہ گزر سے تمہارے قدم نا آشنا نہیں رہے اور راہ گزر بھی ایسی جس پر چلنے کے لیے تم نے باقاعدہ کوئی پلاننگ نہیں کی۔ میرا مطلب ہے تم بنا پلاننگ کے ہی اس راہ پر بہت دور نکل گئی ہو ہے ناں۔'' گل کا چہرہ پھیکا پڑ گیا لیکن پھر فوراً خود پر قابو پا کر کہنے لگی۔

''نان سینس! میں اتنی پاگل نہیں ہوں اور تم کس بنا پر اتنے یقین سے کہہ رہی ہو؟''

''تمہارا چہرہ اور تمہاری آنکھیں خود تمہارے اندر کا احوال بتا رہی ہیں۔''

''ہا..... ہا.....'' گل نے اس کا مذاق اڑایا۔ ''یہ تمہارے اندر کا خوف ہے جو جی جو تم مجھ پر شک کر رہی ہو۔''

''کیسا خوف؟'' اس نے ٹھٹھک کر پوچھا تو گل کندھے اچکا کر بولی۔

''بابر سے دوری کا خوف، تم جانتی ہو ہماری شرط کی مدت ختم ہونے والی ہے اور ظاہر ہے ہارنے کی صورت میں تمہیں منو بھائی سے شادی کرنی ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ''میرا مطلب ہے میں ہاری نہیں ہوں۔''

''ہاری نہیں ہو تو ہار جاؤ گی، کیونکہ ابھی تک تو میرے ساتھ ''محبت ہو جاتی ہے۔'' والا حادثہ نہیں ہوا اور آئندہ بھی امکان نہیں ہے۔'' گل اب مکمل طور پر خود پر قابو پر کر اس کی حالت زار پر مسکرا رہی تھی۔ جس پر وہ الجھ کر بولی۔

''نہیں گل تمہارے ساتھ ایسا حادثہ ہو چکا ہے۔ ایک دو بار میں نے خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے۔''

''کیا..... کیا دیکھا ہے؟'' گل کی مسکراہٹ غائب ہو گئی لیکن وہ گھبرائی نہیں۔

''میں اسے جانتی تو نہیں لیکن وہ جو کوئی بھی تھا اس کے ساتھ چلتے ہوئے تمہارے چہرے پر ایسی ہی دھنک رنگوں کی بارات اتری تھی جیسی میرے چہرے پر دیکھ کر تم چونکی تھی۔'' اس کی بات سن کر گل کچھ دیر تک اس کی طرف یوں دیکھتی رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ وہ کس کی بات کر رہی ہے پھر گویا یاد آنے پر بولی۔

''شاید تم رازی کی بات کر رہی ہو؟''

''میں نے کہا ناں میں اسے نہیں جانتی۔''

''تو اب جان لو۔'' گل نے خود کو نارمل پوز کرنے کی خاطر پہلے اطمینان سے چیئر کی بیک سے کمر ٹکائی پھر اسے دیکھ کر کہنے لگی۔

''رازی میری باجی کا دیور ہے اور ان ہی کے ساتھ قطر میں مقیم ہے آجکل چھٹی پاکستان آیا ہوا ہے۔ ایک بار باجی کے گفٹس وغیرہ دینے آیا تھا۔ پھر باجی نے جو چیزیں یہاں

سے منگوائی ہیں ان ہی کی خریداری کے لیے میں اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ اب اگر اس کے ساتھ آنے جانے کو تم کسی اور نظر سے دیکھ رہی ہو تو یہ تمہاری اپنی سوچ ہے ورنہ میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں۔''

''سچ کہہ رہی ہو؟'' اسے اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود محسوس ہوا۔

''میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔'' پھر جتانے والے انداز میں کہنے لگی۔ ''ویسے رازی ہے اچھا' میرا خیال ہے اس سے محبت کی جاسکتی ہے۔ خیر میں سوچوں گی بلکہ باقاعدہ پلاننگ کروں گی۔''

وہ کچھ گم صم سے انداز میں اسے دیکھے گئی اور اسے اپنا یہ دعویٰ غلط لگ رہا تھا کہ وہ گل کی رگ رگ سے واقف ہے۔ وہ تو شاید اسے جانتی بھی نہیں تھی۔

''سنو۔'' گل نے اسے چونکا دیا۔ پھر کہنے لگی۔

''بھئی اگر تم اتنی ہی خوفزدہ ہو تو ہم شرط ختم کر دیتے ہیں۔''

''نہیں میں خوفزدہ نہیں ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر اپنی کتابیں سمیٹ کر وہاں سے چلی آئی۔

وہ واقعی خوفزدہ تھی اور اگر کوئی اور معاملہ ہوتا تو وہ اعتراف بھی کر لیتی لیکن اب تو جیسے انا کا سوال اٹھ گیا تھا۔ پھر اسے یقین تھا کہ جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا ہے وہی سچ تھا اور گل دھڑلے سے جھٹلا رہی تھی اور یہ سراسر دھوکہ تھا' وہ جتنا سوچتی تو اس کا دکھ بڑھ جاتا کہ گل اس کے ساتھ فاؤل کھیل رہی ہے۔ اگر وہ اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے شرط ختم کرنے کو کہتی تو وہ بڑے آرام سے اس کی بات مان لیتی کیونکہ اپنی جیت کا سہرہ ہارنے والے کے سر پر سجانا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا کہ ہار گئی تھی یا ہار رہی تھی تو بجائے اعتراف کے اس پر احسان کرنا چاہتی تھی جو اسے گوارا نہیں ہوا۔

پھر اگلے کتنے دن اس نے گل کے گھر کا رخ نہیں کیا۔ وہ بلانے آئی تو بہانا کر دیا کہ

اس کے ساتھ بیٹھ کر پڑھائی نہیں ہوسکتی' جب کہ امتحان سر پر ہیں۔ اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ گل نے زیادہ اصرار نہیں کیا بلکہ اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو' ہم بجائے پڑھنے کے باتوں میں وقت برباد کرتے ہیں۔ خیر کچھ دنوں کی بات ہے پھر فراغت سے مل بیٹھیں گے۔'' اس نئی تبدیلی نے بھی اسے دکھ پہنچایا تھا۔

پھر اس نے چاہا اور بہت کوشش کی کہ کم از کم امتحانوں تک ہر بات ذہن سے جھٹک دے لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

اس شام بابر کا فون آیا اس وقت بھی وہ ایسی ہی الجھی ہوئی سی تھی۔ اس نے حال پوچھا اور وہ کہنے لگی۔

''پتہ نہیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''میں نے موسم کا حال تو نہیں پوچھا۔'' اس نے کہا تب چونک کر بولی۔

''کیا مطلب؟''

''بھئی میں تمہارا حال پوچھ رہا ہوں' خیریت سے تو ہو ناں۔''

''ہاں' سب ٹھیک ہیں۔''

''یقیناً سب ٹھیک ہوں گے لیکن تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔'' اس نے جھنجھلا کر کہا تب وہ سوچ کر بولی۔

''اصل میں امتحان ہونے والے ہیں۔''

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ اگر تیاری نہیں ہے تو امتحان ہمت دو۔'' اس نے بڑے آرام سے مشورہ دیا تو وہ فوراً بولی۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہوسکتا؟''

''بس آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں' میں امتحان ضرور دوں گی۔'' اس نے کہہ کر

فون بند کر دیا۔ پھر اپنے کمرے میں آتے ہوئے اچانک احساس ہوا کہ وہ اس سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کر سکی اور یقیناً اس نے بھی محسوس کیا ہوگا۔

''میں کیا کروں' پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔'' وہ سوچتی اور کڑھتی بھی تھی۔

پھر امتحان شروع ہو کر ختم ہو گئے۔ جس روز وہ آخری پیپر دے کر آئی تو لمبی تان کر سو گئی۔ شام میں اٹھی تو کافی فریش تھی۔ شاور لینے کے بعد کچن میں آ کر چائے بنائی پھر کپ لیے ہوئے لان کی طرف جا رہی تھی کہ لاؤنج میں ممی کے ساتھ گل کو بیٹھے دیکھ کر اسی طرف آ گئی۔

''یعنی تم ہمارے سامنے بیٹھ کر چائے پیو گی۔'' گل اس کے ہاتھ میں ایک کپ دیکھ کر چیخی۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں تم بھی موجود ہو۔ خیر یہ تم لے لو میں اپنے لیے اور لے آتی ہوں۔'' اس نے صلح جو انداز میں کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ پھر اپنے لیے لے کر آئی تو گل اسے دیکھ کر بولی۔

''خوب سوئیں؟''

''ہاں۔ اتنے دنوں بعد مزے کی نیند آئی۔''

''مجھے تو سونا نصیب ہی نہیں ہوا' حالانکہ آج میرا پروگرام بھی یہی تھا کہ لمبی تان کر سوؤں گی۔'' گل نے کچھ بیزار سے انداز میں کہا۔ پھر چائے کا کپ خالی کر کے ٹیبل پر رکھا۔ اس کے بعد ممی کو دیکھ کر کہنے لگی۔

''اصل میں باجی کے دیور رازی قطر سے آئے ہوئے ہیں ناں! میں پیپر دے کر آئی تو کہنے لگے بازار چلو۔ انہیں اپنی منگیتر کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔''

''منگیتر.....!'' ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ وہ کچھ چونک کر گل کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بہت سیدھے سادے انداز میں ممی کو بتا رہی تھی۔ اس کے اندر سناٹا اترنے لگا۔ دھڑکنیں بھی مدھم ہو رہی تھیں۔ کتنی دیر تک ممی کو رازی کے بارے میں بتانے کے ساتھ اس کی منگنی اور

شادی کی باتیں کرتی رہی جن میں اس کا اپنا کہیں ذکر نہیں تھا اور اس نے صرف رازی کی منگیتر سنا تھا۔ اس کے بعد گل کی آواز تو آ رہی تھی لیکن وہ کچھ بھی نہیں سن پا رہی تھی' جب گل نے اسے مخاطب کیا تب بھی وہ غائب دماغی سے اسے دیکھے گئی۔

''کیا سوچنے لگیں! چلو ناں باہر چلتے ہیں۔'' گل نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑا تب بھی وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس کے ساتھ کھنچتی چلی آئی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' لان میں آ کر گل نے باقاعدہ اسے جھنجھوڑا، تب وہ حواسوں میں آ کر خواہ مخواہ جھنجھلانے لگی۔

''کیا ہوا ہے مجھے' ٹھیک تو ہوں تم یوں ہی میرے پیچھے پڑ جاتی ہو۔''

''ارے! ایسا کیا کہہ دیا میں نے جو تم ناراض ہونے لگیں۔'' گل نے تعجب کے اظہار کے ساتھ کہا' تب اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ رہی ہے۔ پھر قدرے نادم ہو کر بولی۔

''آئی ایم سوری' میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔''

''لگتا ہے بہت دنوں سے بابر کا فون نہیں آیا۔ یہی بات ہے ناں۔''

''شاید یہی بات ہو۔'' اس نے جھوٹ بولا ورنہ ابھی پرسوں ہی اس کا فون آیا تھا۔

''یعنی بابر کا غصہ مجھ پر نکالتی ہو۔ آنے دو اسے میں تمہارا غصہ اس پر نکالوں گی۔'' گل کے جوش میں آنے پر اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''بس بابا معاف کر دو آئندہ میں کم از کم تمہارے سامنے بہت محتاط رہوں گی۔''

''جاؤ معاف کیا' اب یہ بتاؤ کہ کیا کرنا چاہیے۔'' گل نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

''کیا مطلب؟''

''بھئی امتحان ختم ہو گئے اور مجھ سے گھر بیٹھا نہیں جائے گا۔ کیا خیال ہے جاب تلاش کریں۔''

''جاب.....!'' وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی اور قدرے توقف کے بعد نظریں جھکا کر بولی۔

''میں جاب نہیں کر سکتی۔''

''کیوں؟''

''تمہیں پتہ ہے دو سال پہلے جب میری منگنی ہوئی تھی اسی وقت بابر کے گھر والے شادی پر زور دے رہے تھے اور اب تو وہ بالکل نہیں رکیں گے۔'' اس نے اسی طرح نظریں جھکائے ہوئے سبب بتایا تو گل شرارت سے بولی۔

''تو تم پیا دیس سدھار جاؤ گی۔'' پھر جیسے اچانک خیال آنے پر کہنے لگی۔ ''لیکن جوجی 'تم بابر سے شادی کیسے کر سکتی ہو؟ میرا مطلب ہے ہماری وہ شرط.....؟''

''اس شرط کی مدت غالباً ایک سال تھی۔'' وہ کھوئے ہوئے لہجے میں جیسے اپنے آپ سے بولی لیکن اس نے سن لیا اور بولی۔

''ہاں' اور ایک سال ہونے والا ہے۔''

''پھر.....؟'' اس نے سہم کر دیکھا

''پھر یہ کہ میں شرط جیت گئی۔'' گل نے فاتحانہ انداز میں کندھے اچکائے۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ''اب بتاؤ ممی کو تمہارے گھر کب بھیجوں منو بھائی کے پروپوزل کے ساتھ۔''

''گل۔'' وہ چکرا کر رہ گئی۔ اتنی بڑی بات اس نے کتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی پھر یک دم پلٹ کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ کر بند ہو گئی۔ آنسو بھی بے اختیار چھلک آئے تھے۔ دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روئے' پھر جا کر شرط ختم کرنے کے ساتھ گل سے بھی سارے ناتے توڑ ڈالے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکی چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔

رات میں ممی نے کھانے کے لیے بلوایا تب وہ کمرے سے نکل کر آئی تو ڈائننگ روم

میں پاپا کے ساتھ بابر کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ ایک اچٹتی نظر اس پر ڈال کر انجان بن گیا اور کھانے کے دوران بھی پاپا کے ساتھ ہی باتیں کرتا رہا۔ اسے پہلے ہی بھوک نہیں تھی۔ محض ممی پاپا کا خیال کر کے چلی آئی تھی اور اب بابر کو دیکھ کر تو بالکل ہی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بمشکل چند نوالے حلق سے اتارے اور ممی کے ٹوکنے کے باوجود اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

بابر کی اچانک آمد نہ صرف حیران بلکہ پریشان کن بھی تھی۔ پرسوں فون پر تو اس نے اشارتاً بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس سلسلے میں آیا ہے حالانکہ اس سے جو نسبت اور جو ربط تھا اس حساب سے تو اسے فریش ہونا چاہیے تھا اور وہ خوش ہونا بھی چاہتی تھی لیکن گل کی باتوں نے اسے ایک پل کو بھی خوشی محسوس نہیں ہونے دی۔ عجیب مشکل تھی۔ وہ مسلسل اوٹ پٹانگ سوچتی رہی۔

صبح اٹھی تو رونے اور رات دیر تک جاگنے کے باعث آنکھیں سرخ اور پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ کتنی دیر تک ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی رہی' پھر بھی سرخی نہیں گئی۔ ممی پاپا کے ساتھ بابر کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔

اسے ڈر تھا کہ اگر ممی نے اس کے سامنے ہی اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا تو وہ بے اختیار رو پڑے گی۔ اور جتنا وہ اس سے بچنا چاہ رہی تھی ناشتے کے بعد وہ خود ہی اس کے کمرے میں چلا آیا۔

''السلام علیکم۔'' اس کے سلام کرنے پر وہ فوراً اس کی طرف پلٹی تو وہ جو ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ لیے کھڑا تھا تشویس سے پوچھنے لگا۔

''تم ٹھیک تو ہو میرا مطلب.....''

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ ٹوک کر قصداً مسکرائی' پھر پوچھنے لگی۔ ''آپ کیسے ہیں؟''

''تم نے ناشتہ نہیں کیا؟'' وہ اس کا سوال نظر انداز کر گیا۔

''دل نہیں چاہا۔''

''دل کیا چاہتا ہے۔'' وہ قدرے شوخی سے کہتا ہوا قریب آ گیا تو وہ گھبرا کر رخ مو
گئی۔

''جو یہ کیا ہے' میں صرف تمہارے لیے آیا ہوں۔ ادھر میری طرف دیکھ کر بات کر
تمہیں کیا پریشانی ہے۔'' اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور بڑی دقتوں سے بول پڑی۔

''نہیں تو' مجھے کیا پریشانی ہوگی۔''

''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ فون پر ٹھیک سے بات نہیں کرتیں اور ابھی بھی مجھے دیکھ
کر تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی۔''

''آپ کے خیال میں مجھے خوشی کا اظہار کس طرح کرنا چاہیے۔'' اس کے پوچھنے
جانے کیوں وہ خاموش سا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسے پلٹ کر دیکھنا پڑا کہ آیا وہ موجود ہے یا جا چکا۔
اور اسے کھڑے دیکھ کر خجل سی ہو کر بولی۔

''آپ کھڑے کیوں ہیں بیٹھیں ناں۔''

''نہیں' تم ناشتہ کر لو پھر کہیں باہر چلتے ہیں۔'' وہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تو اس
کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ کچھ دیر شش و پنج میں کھڑی رہی۔ پھر ڈریس چینج کر کے ممی سے کہتی
ہوئی اس کے پیچھے چلی آئی۔ وہ گاڑی سے ٹیک لگائے منتظر کھڑا تھا اسے دیکھتے ہی دروازہ کھول
دیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''کہاں چلیں؟'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کسی ایسی جگہ جہاں سارے خوف سارے اندیشے دم توڑ جائیں۔'' وہ جانے کس
خیال میں گھر کر کھوئے ہوئے لہجے میں بولی تو وہ مڑ میں اسے دیکھنے لگا۔ ہمیشہ سے کتنی مختلف نظر
رہی تھی نہ آنکھوں میں وہ چمک تھی نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور نہ چہرے پر دھنک رنگوں کی
برسات..... وہ دھیرے سے پوچھنے لگا۔

''کن اندیشوں کی بات کرتی ہو اور تمہیں کس بات کا خوف ہے۔''

''میں.....'' وہ اپنے خیال سے چونکی۔ پھر گہری سانس کھینچ کر بولی۔ ''پتہ نہیں کیوں
عجیب عجیب سے واہمے ستانے لگے ہیں۔''

''میری موجودگی میں بھی۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور ذرا سا رخ موڑ کر شیشے
سے باہر دیکھنے لگی' ہر طرف زندگی رواں دواں تھی۔ روزگار کے لیے نکلے ہوئے لوگ اس وقت
کتنے فریش نظر آ رہے تھے' پھر وہ اس کا خیال کر کے سیدھی ہو بیٹھی اور سامنے سے کیسٹ اٹھا کر
دیکھنے لگی' لیکن اس سے پہلے ہی بابر نے پلیئر آن کر دیا۔ وہی دھیمی دھیمی موسیقی اور دھیمے دھیمے سر
تھے۔

دھڑکتے ہیں دل آزادیوں سے
بہت ملتے جلتے ہیں ان وادیوں سے
محبت کی رنگیں پناہوں کے سائے
مجھے گھیر لیتے ہیں بانہوں کے سائے
یہ دل اور ان کی.....

کتنے خوبصورت لمحات نگاہوں میں آن سمائے تھے۔ وہ سرسبز وادیاں' وہ اس کی بانہوں
کے حصار میں دھڑکنوں کا انداز بدلنا۔ پھر اس کی سرگوشی ''مجھے بابر کہتے ہیں'' اور شاید وہ اسے وہی
لمحات یاد دلانا چاہتا تھا اور اب اس کی آنکھوں میں جھلملاتے عکس بہت اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

دل نے بہت اصرار کیا اسے چھیڑ کر دیکھے لیکن اس نے دل کا کہا نہیں مانا مبادا وہ پھر
سے انجان بن جائے۔ ساحل سے آتی نم ہوا نے اس کے چہرے کو چھوا' تب وہ چونک کر ادھر ادھر
دیکھنے لگی اور اس وقت وہ قدرے انجان بن گیا۔ پھر ایک جگہ گاڑی روک کر اس سے پوچھنے لگا۔

''تم نے ناشتہ کیا تھا؟'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا تو دروازہ کھولتا ہوا بولا۔ ''چلو پہلے کچھ
کھا لو۔''

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''تمہارے دل کی ایسی کی تیسی۔ چلو اترو۔'' اس نے رعب سے کہا تو وہ کچھ روٹھی ہوئی سی اپنی طرف سے دروازہ کھول کر اتر گئی اور ایسے ہی انداز میں اس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی۔

''موڈ ٹھیک کرو' یوں لگ رہا ہے جیسے میں تمہیں زبردستی لایا ہوں۔'' وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا بولا۔

''تو اور کیسے لائے ہیں۔'' وہ کہہ کر گلاس وال سے پرے جھاگ اڑاتے سمندر کو دیکھنے لگی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم میرے ساتھ آنا نہیں چاہتی تھیں؟'' وہ کچھ نہیں بولی تب اس نے پہلے ویٹر کو بلا کر چائے کے ساتھ سینڈوچز کا آرڈر دیا۔ پھر بہت خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب ویٹر چائے وغیرہ رکھ کر چلا گیا اور وہ پھر بھی متوجہ نہیں ہوئی' تب اسے مخاطب کرنا پڑا۔

''جویریہ! چائے لو۔'' اس نے ایک نظر ٹیبل پر ڈالی۔ پھر اسی خاموشی سے چائے بنا کر ایک کپ اس کے سامنے رکھ دیا اور اپنے کپ میں دھیرے دھیرے چمچ چلانے لگی۔

''بس کرو' چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' اس نے ٹوکا' تب چمچ رکھ کر اس نے سینڈوچ اٹھا لیا اور کھانے کے ساتھ گھونٹ گھونٹ چائے بھی پینے لگی۔ وہ اس کی غیر معمولی خاموشی اور بار بار کھو جانا بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اپنے طور پر سبب بھی سوچ رہا تھا۔

''سنو جویریہ!'' کتنی دیر بعد وہ اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں' دو سال پہلے جب ہماری انگیجمنٹ ہوئی تھی اس وقت تمہارے دل میں بھی میرے لیے ایسی ہی محبت تھی پھر وہ محبت ختم ہوئی۔''

''جی۔'' وہ ناسمجھی کے عالم میں دیکھنے لگی تو وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر درمیان

دھوئیں کی چادر تان کر بولا۔

''مجھ سے جھوٹ مت بولنا' اگر کسی نے میری محبت کو دھندلا دیا ہے تو صاف کہو' میں تم سے کوئی شکوہ کیے بغیر تمہاری دنیا سے بہت دور چلا جاؤں گا' صرف تمہاری خوشی کی خاطر۔''

''بابر.....'' وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔

''میرا یقین کرو میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ بس مجھے اتنا بتا دو کہ.....''

''پلیز بابر.....'' اس نے انتہائی عاجزی سے ٹوک دیا۔ پھر بمشکل خود پر قابو پا کر کہنے لگی۔ ''آپ کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔''

''اور جو تم مجھے دکھ دے رہی ہو۔''

''میں نے کیا کہا ہے آپ سے؟''

''کچھ کہو ناں' آخر کیا بات تمہیں پریشان کر رہی ہے۔'' وہ زچ ہو کر بولا تو وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر سر جھکا کر میز کی چکنی سطح پر انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے گل سے لگائی شرط کا سارا احوال کہہ سنایا۔ پھر آخر میں کچھ ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد حیران تھا۔ بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

''آپ کچھ کہیں گے نہیں۔'' اس نے ایسے ہی ڈرتے ہوئے انداز میں پوچھا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں' سوائے اس کے کہ تم دونوں پاگل ہو۔'' اس کے ساتھ ہی ویٹر کو بلا کر بل پے کیا۔ پھر اٹھتا ہوا بولا۔

''چلو! گل سے تو میں ابھی نمٹتا ہوں' آخر کیا سوچ کر اس نے یہ شرط لگائی۔''

''نہیں بابر۔'' وہ اس کے پیچھے آتی ہوئی بولی۔ ''آپ گل سے کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ پہل میری طرف سے ہوئی تھی۔''

''شٹ اپ! چلو بیٹھو۔'' وہ اس کے لیے دروازہ کھول کر خود ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ

گیا۔ پھر اس کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کردی۔ وہ اس کے تیور بھانپ کر منت سے بولی۔

''پلیز بابر میری بات سنیں۔''

''مزید کیا سنانا چاہتی ہو؟''

''آپ بات نہیں سمجھ رہے' یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ ہم نے بہت سنجیدگی سے شرط لگائی تھی۔ اگر آپ گل کے پاس گئے تو وہ سمجھے گی.....'' آنسو چھلک جانے کے باعث وہ اپنی بات پوری نہ کرسکی۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے روتے ہوئے دیکھا۔ پھر ہونٹ بھینچ کر سامنے متوجہ ہوگیا۔ کتنی دیر بعد جب وہ آنسوؤں پر بند باندھنے میں کامیاب ہوگئی تب کہنے لگی۔

''آپ کو میری قسم آپ گل سے کچھ نہیں کہیں گے۔'' وہ کچھ نہیں بولا لیکن بڑھتی ہوئی اسپیڈ اور اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھوں کی مضبوط ہوتی گرفت اس کے اندرونی اضطراب کی غماز تھی۔ وہ جان گئی اگر اس نے مزید کچھ کہا تو وہ گاڑی کسی تیز رفتار بس سے ٹکرادے گا۔ جبھی خاموشی اختیار کرگئی۔ اور جب گاڑی گھر کے سامنے رکی تب بھی چپ چاپ اترنے لگی کہ وہ رک کر بولا۔

''سنو' میں شام کی فلائیٹ سے واپس جارہا ہوں۔ تمہیں جب اپنی غلطی یا حماقت کا احساس ہو تو مجھے فون کرلینا۔''

''میں نے کوئی حماقت نہیں کی۔'' وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک کہتی ہو' احمق میں ہوں جو تم جیسی پاگل لڑکی کے لیے دیوانہ ہورہا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ایک جھٹکے سے گاڑی بڑھا لے گیا' وہ حیران کھڑی رہ گئی۔ پھر اپنے گھر جانے کی بجائے گل کے پاس چلی آئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں قالین پر اوندھی لیٹی فون پر جانے کس سے بات کررہی تھی کہ اسے دیکھ کر فوراً ریسیور رکھ دیا۔ پھر اٹھ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''میں ابھی تمہارے پاس آنے کا سوچ رہی تھی۔''

''تم نے سوچا اور میں آگئی۔'' وہ اس کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔ پھر پوچھنے لگی۔

''تمہاری جاب کا کیا ہوا؟''

''ہاں' ایک دو جگہ اپلائی کیا ہے دیکھو کب کال آتی ہے۔''

''میرا مشورہ مانو جاب کا خیال چھوڑ کر شادی کا سوچو۔'' اس نے خود کو بہلانے کی خاطر ہلکا پھلکا موضوع چھیڑا اور گل نے اس کی بات پکڑلی۔

''اس کا مطلب ہے تم شادی کرنا چاہتی ہو۔ میں آج ہی ممی سے بات کروں گی بلکہ ایسا کرو پہلے تم خود منو بھائی سے بات کرلو۔''

''کیا مطلب؟'' وہ جیسے سمجھ کر بھی نہیں سمجھی۔

''بھئی انہیں بتادو کہ تم ان سے شادی کرنا چاہتی ہو۔''

''لیکن میں تو ایسا نہیں چاہتی۔'' گل کے اتنے آرام سے کہنے پر وہ اندر ہی اندر تلملا کر بولی۔

''میں جانتی ہوں تم ایسا نہیں چاہتیں لیکن تم شرط ہار چکی ہو۔'' گل اتنے نارمل انداز میں بول رہی تھی جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو' بالکل اسی طرح جیسے پہلے کبھی جیتنے کی صورت میں اس سے آئسکریم یا کوک کا مطالبہ کرتی تھی' اب اس سے اس کا جیون مانگ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا بابر کی طرح اسے احمق اور پاگل کہہ کر وہاں سے چلی آئے اور کہنے جارہی تھی کہ گل بول پڑی۔

''بھئی' تم تو ابھی سے ڈانواں ڈول ہورہی ہو' میرا خیال ہے جانے دو ہم اس شرط کو ختم کردیتے ہیں بس تم یہ تسلیم کرلو کہ محبت ہوتی نہیں بلکہ کی جاتی ہے۔''

''نہیں' محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی' اور جو پلاننگ کے تحت کی جائے وہ محبت نہیں ہوتی۔'' وہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے رک کر بولی۔

''ابھی بھی میں ہاری نہیں ہوں بس یہ ہے کہ ہماری شرط کی مدت ختم ہوگئی' ورنہ یاد رکھو گل ہر انسان کی زندگی کو نیا موڑ دینے والا لمحہ ضرور آتا ہے۔ اور اس عرصے میں ایسا نہیں ہوا تو آئندہ کبھی تمہاری زندگی میں بھی ایسا لمحہ ضرور آئے گا تب تم میری بات سے اتفاق کروگی۔''

''ہوسکتا ہے لیکن ابھی تو ہماری ہار جیت کا فیصلہ ہوچکا۔'' گل نے کندھے اچکا کر جتایا

تو وہ سمجھ کر اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

''ہاں۔ میں ہار چکی ہوں اور سزا کے لیے منو بھائی کے پاس جا رہی ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ڈرائنگ روم سے نکل آئی۔ قدم من بھر کے ہو رہے تھے پھر بھی وہ لاؤنج سے گزر کر راہداری کے آخری سرے تک چلی آئی' اور بہت آہستہ آہستہ سے دروازے پر دستک دی تو اندر سے منو بھائی کی آواز آئی۔

''کون ہے آ جاؤ۔'' اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دروازے کو دھکا دیا پھر اندر داخل ہوئی تو منو بھائی اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

''آپ.....؟''

''جی السلام علیکم۔'' اس نے گھبرا کر سلام کر دیا۔

''وعلیکم السلام' گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا؟'' جواب دینے کے ساتھ ہی انہوں نے پوچھا تو وہ آہستہ سے بولی۔

''سب ہیں۔''

''پھر.....؟'' ان کی حیرت میں کمی نہیں آ رہی تھی بلکہ اس کے جواب پر مزید بڑھ گئی۔

''پھر یہ کہ میں آپ کے پاس آئی ہوں اور اگر آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا تو چلی جاتی ہوں پھر کسی وقت آ جاؤں گی۔'' وہ کہہ کر جانے لگی کہ انہوں نے روک دیا۔

''نہیں' آپ بیٹھیں۔''

''شکریہ۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ایک کرسی پر قدرے تکلف سے بیٹھ گئی تو وہ کہنے لگی۔

''کوئی کام ہے تو بتایئے۔'' اس کے اندر جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ جو شخص اپنا کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتا وہ اس سے کام پوچھ رہا تھا ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آن ٹھہری اور بالکل غیر ارادی طور پر نظریں ان کے چہرے سے پھسلتی ہوئی بیساکھی پر جا ٹھہریں اور وہ نادان

نہیں تھے۔ دکھ سے بولے۔

''میں بھلا آپ کے کس کام آ سکتا ہوں۔''

وہ فوراً کچھ نہیں بولی' بس اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی گئی اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ ایک ذرا سی بات کیسے انا کا سوال بن گئی تھی۔ اسے یاد آیا بہت پہلے اس کے پاس ایک بہت خوبصورت گڑیا تھی اور ایسے ہی کسی بات پر شرط لگاتے ہوئے گل نے کہا تھا کہ اگر وہ ہار گئی تو گڑیا اسے دے دے گی۔ اس نے جوش میں ہامی تو بھر لی لیکن پھر دو دن تک اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اپنی اتنی پیاری گڑیا گل کو دینے کا خیال اسے پریشان کرتا رہا تھا بلکہ ایک دو بار تو وہ چپکے چپکے روئی بھی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ شرط جیت گئی تو وہ جو گڑیا چھن جانے کا خوف تھا اس سے نجات پا کر اسے یوں لگا تھا جیسے وہ پھر سے زندہ ہوئی ہو۔ کتنی خوش ہوئی تھی وہ۔

''جویریہ۔'' منو بھائی کے پکارنے پر وہ اپنے خیال سے چونک کر انہیں دیکھنے لگی تو وہ کچھ الجھ کر بولے۔

''آپ یہاں کیوں آئی ہیں' میرا مطلب ہے میرے کمرے میں۔''

''بس یوں ہی۔'' وہ افسردگی میں گھر کر بولی اور سست روی سے دوبارہ اسی جگہ آ بیٹھی تو منو بھائی پریشان سے ہو گئے کہ آخر وہ ان سے کیا چاہتی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آیا تو پوچھنے لگے۔

''آپ چائے پئیں گی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور قدرے توقف سے خود پر قابو پا کر بولی۔

''میں تو بس یہ دیکھنے آئی تھی کہ آپ سارا دن کمرے میں بند ہو کر کیا کرتے رہتے ہیں۔''

''مجھے کیا کرنا ہے' کبھی پڑھ لیتا ہوں کبھی لکھ لیتا ہوں۔''

''کیا لکھتے ہیں؟'' اس کی حیرت میں چھپے تجسس کو محسوس کر کے وہ ذرا سا مسکرائے پھر آ کر اپنے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''مضامین اور افسانے وغیرہ۔''

''آپ میرا مطلب ہے آپ؟''

''مجھ جیسا بندہ یہی کر سکتا ہے' ویسے آپ کو میرے لکھنے پر اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے۔''

''حیرت آپ کے لکھنے پر نہیں بلکہ اس بات پر ہو رہی ہے کہ آپ نے کبھی بتایا نہیں۔''

وہ اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتی ہوئی بولی۔

''پہلے کبھی آپ نے پوچھا ہی نہیں۔''

''کب سے لکھ رہے ہیں؟'' وہ ان کی بات قصداً نظر انداز کر گئی۔

''مجھے خود یاد نہیں کہ میں نے کب لکھنا شروع کیا۔'' وہ جانے کس خیال میں گھر کر بولے۔

''کس بات نے آپ کو لکھنے پر اکسایا تھا؟''

''شاید دل پر پڑنے والی پہلی چوٹ نے۔'' پھر خود ہی چونکے اور اسے دیکھ کر مسکرا کر پوچھنے لگے۔ ''کیا آپ میرا انٹرویو کر رہی ہیں؟''

''یہی سمجھ لیں۔'' وقتی طور پر وہ اپنی پریشانی بھلا کر اک نئے تجسس میں گرفتار ہو گئی تھی۔

''پھر تو مجھے خاموش ہو جانا چاہیے کیونکہ میں اپنے آپ کو خود سے بھی پوشیدہ رکھتا ہوں۔''

''کیوں.....؟'' اس نے فوراً پوچھا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''بتائیں ناں منو بھائی! میں کون سا باقاعدہ آپ کا انٹرویو چھاپنے جا رہی ہوں۔''

''کوئی اور بات کریں؟''

''اور کیا بات کروں۔''

''بہت ساری باتیں ہیں' چلیے وہ بات کہہ دیں جو آپ کو میرے کمرے تک لائی ہے۔'' انہوں نے انجانے میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ کچھ دیر تک بے دھیانی میں انہیں دیکھتی رہی۔ پھر کچھ کہے بغیر ان کے کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

اس کا خیال تھا بابر محض اسے دھمکی دے گیا ہے کہ وہ شام کی فلائٹ سے واپس چلا جائے گا لیکن وہ سچ مچ چلا گیا۔ جانے سے پہلے فون تک نہیں کیا جس سے ظاہر تھا کہ وہ ناراض ہو گیا ہے اور اس کی ناراضگی کو شدت سے محسوس کرنے کے باوجود وہ اسے فون نہیں کر رہی تھی حالانکہ دل اصرار کر رہا تھا اور کتنی بار وہ فون تک آئی بھی لیکن یہ سوچ کر باز رہی کہ جانے وہ کیا سمجھے۔

اپنے تئیں وہ یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ گل سے ہار کر وہ اپنی محبت ہار چکی ہے اور کیونکہ اب اسے منو بھائی سے شادی کرنی ہے اس لیے بابر کو فون کر کے وہ اسے کوئی آس نہیں دلانا چاہتی تھی۔ حالانکہ خود اس کی اپنی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ حد درجہ بیزاری چھائی ہوئی تھی جیسے دنیا میں اب اس کے لیے کچھ رہا ہی نہیں۔

اس شام اپنے کمرے سے نکلی تو ممی کے ساتھ گل کی ممی کو بیٹھے دیکھ کر اتنی خوفزدہ ہوئی کہ الٹے پیروں پیچھے ہٹنے لگی۔ غالباً پہلا خیال یہی آیا کہ وہ منو بھائی کا پروپوزل لے کر آئی ہیں۔

''جو جی۔'' ممی کے پکارنے پر اس کے پیچھے ہٹتے قدم رک گئے اور حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔

''جی ممی۔''

''بیٹا ذرا چائے بنا دو۔'' ممی اس سے کہہ کر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئیں اور وہ ایسی ہی سہمی ہوئی سی کچن میں آ کر چائے بنانے لگی۔ جب کہ دھیان مسلسل ممی اور آنٹی کی طرف تھا کہ پتہ نہیں وہ کیا باتیں کر رہی ہیں۔ پھر چائے لے کر اندر آئی تو آنٹی اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

''کیا بات ہے بیٹا' گل سے تمہاری لڑائی ہوگئی ہے کیا؟''

''نہیں تو۔''

''پھر تم نے آنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔''

''گل بھی تو نہیں آئی۔'' اس نے بلا ارادہ شکوہ کر ڈالا۔ پھر چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

''بے فکر رہیں آنٹی میری اور گل کی کبھی لڑائی ہو ہی نہیں سکتی۔''

''مجھے پتہ ہے بیٹا۔'' پھر ممی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگیں۔ ''اس روز میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ جب گل قطر چلی جائے گی تو.....''

''گل قطر جا رہی ہے؟'' اس نے چونک کر پوچھا تو وہ مسکرا کر بولیں۔

''ظاہر ہے بیٹا شادی کے بعد وہیں جائے گی۔ کیا تمہیں گل نے نہیں بتایا کہ رازی کے ساتھ اس کی نسبت طے ہو چکی ہے۔'' اس انکشاف نے اسے اتنا حیران کیا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ پھر اچانک ذہن میں جھکڑ چلنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے برسوں کی دوستی میں دشمنی کا رنگ کب اور کیوں شامل ہوا تھا۔ اور یہی پوچھنے وہ اسی وقت گل کی طرف چلی آئی۔

گل اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی ڈرائنگ روم تک آئی تو رازی کی آواز سن کر دروازے پر ہی رک گئی۔ وہ بہت اصرار سے کہہ رہا تھا۔

''چلو ناں کہیں باہر چلتے ہیں۔''

''نہیں رازی' ابھی میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی۔'' گل الجھ رہی تھی۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ پہلے بھی مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر جو جی کو شک ہو گیا تھا بلکہ وہ یقین سے کہہ رہی تھی کہ میں شرط ہار گئی ہوں۔''

''کیسی شرط؟''

''بتاؤں گی کبھی' بس ابھی جو جی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں واقعی ہار گئی تھی۔'' اس کے اندر دور تک سناٹا پھیل گیا اور آنکھوں میں اس روانی سے پانی اترا کہ ہر طرف دھند چھا گئی۔ کاش وہ سچ مچ ہار جاتی اور سزا کے طور پر منو بھائی سے شادی کر کے بھی اسے اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا دکھ دوستی کا مان ٹوٹ جانے پر ہو رہا تھا۔

''ابھی بتاؤ ناں۔'' رازی غالباً تجسس میں مبتلا ہو کر اصرار کر رہا تھا اور اس سے پہلے کہ گل بتاتی وہ دھند میں راستہ ڈھونڈتی ہوئی برآمدے میں نکل آئی۔ ستون کے پاس رک کر آنکھیں صاف کر رہی تھی کہ منو بھائی پر نظر پڑی جو حسب معمول پودوں کو پانی دے رہے تھے۔ وہ جانے کس خیال کے تحت ان کے پاس چلی آئی۔ سلام کیا تو انہوں نے جواب دینے کے ساتھ پوچھا۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''جی.....ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔'' انہوں نے ایک لحظ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر بظاہر اپنے کام میں مصروف ہو گئے تو وہ قدرے رک کر بولی۔

''منو بھائی وہ آپ کے دل پر پڑنے والی پہلی چوٹ کیا تھی۔'' انہیں شاید اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ جب ہی چونک کر دیکھا۔ بہت ٹوٹی ہوئی شکستہ سی نظر آ رہی تھی وہ۔ تب نظریں چراتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''آپ کے دل پر بھی چوٹ پڑی ہے کیا؟''

''آپ میری بات کا جواب دیں۔''

''سوری جویریہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں اپنے آپ کو خود سے بھی پوشیدہ رکھتا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے پودوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے وہ کھڑی دیکھتی رہی جب وہ لان کے آخری سرے تک پہنچ گئے تب وہ تیز قدموں سے ان کے پاس آ کر بولی۔

''نہیں منو بھائی! آپ لاکھ خود کو اپنے آپ سے پوشیدہ رکھیں' مجھ پر آپ کو اپنی ذات کے اسرار واضح کرنے ہوں گے اس لیے کہ زندگی کا بقیہ سفر ہم نے ایک ساتھ طے کرنا ہے۔''

''جویریہ۔'' وہ ایکدم سناٹے میں آ کر اسے دیکھنے لگے تو وہ دل میں اٹھتی ٹیسوں کو دباتی ہوئی بولی۔

''ہاں' میں آپ سے شادی کروں گی۔'' وہ جس طرح اچانک سناٹے میں آئے تھے اسی طرح فوراً سنبھل کر ذرا سا مسکرائے اور قدرے طنزآمیز لہجے میں پوچھا۔

''کیوں کیا آپ شرط ہار گئیں؟''

''جی۔'' اب کے سناٹے میں آنے کی باری اس کی تھی اور وہ اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تاسف سے کہنے لگے۔

''میری ذات کے کون سے اسرار جاننا چاہتی ہیں آپ' سب کچھ تو واضح ہے آپ پر کہ لوگ خود کو سزا دینے کے لیے میرا ساتھ تجویز کرتے ہیں۔ یہی میرا دکھ ہے۔''

''منو بھائی!'' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

''ارے میں نے آپ سے کوئی شکوہ تو نہیں کیا۔ بس ایک درخواست ہے کہ آئندہ کبھی جوش میں آ کر کسی حرماں نصیب کی طرف اشارہ مت کیجیے گا۔'' وہ دکھ سے کہتے ہوئے لان سے نکل کر اندر جانے لگے تو ان کی بیساکھی کی ٹک ٹک میں اس کی سسکیاں دب کر رہ گئیں۔

اس نے چاہا کہ انہیں روک کر کہے کہ وہ شرط ہاری نہیں ہے لیکن وہ انہیں دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکی اور وہیں سے باڑھ پھلانگ کر اپنے گھر آ گئی۔

وہ ایسی نہیں تھی اس نے قصداً کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی تھی پھر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے۔ گل سے دوستی دو چار دن کی نہیں تھی برسوں کا ساتھ تھا اور ایک ذرا سی بات پر جس طرح گل نے برس ہا برس کی دوستی پر چند روز کی محبت کو ترجیح دیتے ہوئے اسے فریب دینے کی کوشش کی تھی۔ اس سے جہاں اس کا دوستی پر سے اعتماد اٹھا تھا اور انتہائی کرب سے دوچار ہو کر وہیں اسے منو بھائی کے دکھ نے بے تحاشا رُلایا تھا اور کوئی ایک بات تو تھی نہیں۔ کبھی بابر کی ناراضگی کا خیال' کبھی گل کی بے وفائی اور کبھی منو بھائی کا دکھ اور جیسے ہر بات کا

ماتم کرنے کو وہ تنہا رہ گئی تھی۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ اس نے انجانے میں ایک حرماں نصیب شخص کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ وہ نہ صرف اپس کا اشارہ دیکھ چکا ہے بلکہ اس کی باتیں بھی سن رہا تھا تو وہ اسی وقت اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لیتی لیکن اسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال ابھی بھی وہ ان سے معافی مانگنا چاہتی تھی کیونکہ اس کا مقصد ان کی دل آزاری ہرگز نہیں تھا لیکن ان کا سامنا کرنے کے لیے بہت ہمت چاہیے تھی۔

دن میں کتنی بار ارادہ کرتی لیکن حوصلے جواب دے جاتے۔ یوں ہی کتنے دن گزرے۔ اس دوران گل نے ایک بار بھی آ کر نہیں پوچھا کہ وہ کہاں غائب ہے اور وہ گل سے شاکی نہیں تھی۔ کیونکہ شکوہ دوستوں سے کیا جاتا ہے یا پھر دشمنوں سے اور گل سے اب اس کا ایسا کوئی ناتا نہیں تھا۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ایک بار پھر خود کو منو بھائی کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ کیونکہ یہ طے تھا کہ جب تک وہ ان سے اپنی نادانی کی معافی نہ مانگ لیتی اسے کوئی لمحہ سکون کا میسر نہیں آ سکتا تھا کہ اتنے دنوں بعد گل کی آمد پر وہ قدرے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' گل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ نہ جانے کیوں اسے اس کی ہر ادا اجنبی سی لگی' اس کی مسکراہٹ میں بھی مصنوعی پن تھا۔

''کچھ نہیں' آؤ بیٹھو۔'' اس نے بیڈ پر آگے سرکتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیا ناراض ہو؟'' گل نے بیٹھتے ہوئے اس کے سپاٹ چہرے کو بغور دیکھا اور وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

''نہیں' میں کیوں ناراض ہوں گی۔'' گل خاموش ہو کر یوں ادھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اب کیا بات کرے۔ وہ کچھ دیر تک انتظار کرتی رہی پھر گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کر بولی۔

''سنو' میں نے منو بھائی سے شادی کی بات کی تھی لیکن انہوں نے کوئی جواب

نہیں دیا۔'' وہ خاموش ہو کر پھر گل کے بولنے کا انتظار کرنے لگی لیکن نہ جانے کیوں وہ چپ تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اونچا کر کے دیکھا اس کی آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''گل۔'' وہ پریشان ہو گئی۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''مجھے معاف کر دو جوجی۔'' اس نے کہا اور مٹھی میں بند لفافہ اس کے پاس پھینک کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا پہلے اسے چپ کرانے کا سوچا لیکن پھر لفافہ اٹھا کر کھولنے لگی۔ اندر سے تہ شدہ کاغذ نکالا اور جلدی جلدی اس پر نظریں دوڑانے لگی۔ رازی کا خط تھا۔

''گل میں تمہاری محبت پر شبہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تمہاری محبت کبھی پائیدار نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ تم نے برسہا برس کی دوستی کا خیال نہیں کیا بھر بھلا میں تم سے کیا توقع رکھوں۔

اگر تم ایمانداری سے جویریہ کے سامنے اپنی ہار تسلیم کر لیتیں تو یقین کرو میں تمہارے لیے اس لڑکی کے سامنے دامن پھیلا کر تمہیں مانگ لیتا۔ تمہاری خود غرضی کو دیکھتے ہوئے مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں نے انتخاب میں غلطی کی۔''

رازی

اس نے خط ایک طرف ڈال کر روتی ہوئی گل کو دیکھا تو سچ مچ اسے بہت دکھ ہوا۔ دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ کہنے لگی۔

''مجھے معاف کر دو جوجی، میں نے تمہارے ساتھ فاؤل کیا۔ میں ہار گئی تھی پھر بھی.....''

''میں جانتی ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم.....'' گل ہاتھ نیچے گرا کر اسے دیکھنے لگی تو وہ ذرا سا مسکرائی۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

''تمہیں رازی سے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ جاؤ اسے بتاؤ کہ.....''

''نہیں.....'' گل فوراً بول پڑی۔ ''میں رازی کے پاس نہیں بلکہ منو بھائی کے پاس جاؤں گی جن کی محبت برسہا برس سے نظر انداز کرتی آ رہی ہوں۔''

''لیکن گل.....'' وہ پریشان ہو گئی تو گل اس کا ہاتھ دبا کر مسکرائی۔ پھر اٹھ کر جانے لگی کہ وہ رُک کر بولی۔

''سنو گل! منو بھائی سے یہ مت کہنا کہ تم ہار کر ان کے پاس آئی ہو۔''

''میں ہار کر ہی جا رہی ہوں جوجی! شرط میں نہیں..... اُن کی محبت میں۔'' جانے کیوں اس کی پلکیں نم ہونے لگیں کہ وہ جلدی سے باہر نکل گئی اور وہ کتنی دیر تک ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے مسکرائی، اور لابی میں آ کر بابر کا نمبر ڈائل کرنے لگی وہ اس کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے ساتھ یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ اس غلطی کے باعث ہی ایک حرماں نصیب شخص کی زندگی میں بہار اتر رہی تھی۔

☆☆☆

محمد قیوم اعوان کے بے مثال تراجم اور تخلیقات

لاشریک	قیمت 150 روپے
کنٹرول مائنڈ	قیمت 200 روپے
کامیاب بزنس مین بنئے	قیمت 300 روپے
طاقت حاصل کرنے کے 48 قوانین	قیمت 400 روپے
انوکھی جنت	قیمت 150 روپے
بیورو کریسی کا زوال	قیمت 200 روپے
میں ایک عام پاکستانی ہوں	قیمت 150 روپے

حیران کن انکشافات اور سازشوں کی روداد

ہاں! میں باغی ہوں	مصنف: جاوید ہاشمی قیمت 600 روپے
انکشافات	مصنف: انوار ہاشمی قیمت 160 روپے
طالبان، ملا عمر اور اسامہ	مصنف: انوار ہاشمی قیمت 125 روپے
ٹاپ سیکرٹ	مصنف: رائے اسد کھرل قیمت 130 روپے
بین الاقوامی مافیا	مصنف: محمد انیس الرحمٰن قیمت 150 روپے

عمیرہ احمد کے ناقابل فراموش ناول

میری ذات ذرہ بے نشان	قیمت 200 روپے
میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے	قیمت 200 روپے
سحر اک استعارہ ہے	قیمت 200 روپے
لاحاصل	قیمت 200 روپے
زندگی گلزار ہے	قیمت 200 روپے

خواتین ناول نگاروں کی تخلیقات

شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	قیمت 400 روپے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے	شازیہ چوہدری	قیمت 400 روپے
شوخی گفتار	انجم انصار	قیمت 200 روپے
رنگ چاہت کے	انجم انصار	قیمت 150 روپے
حسینوں کے خطوط	انجم انصار	قیمت 200 روپے
مے ڈے	نگہت سیما	قیمت 180 روپے
تریاق	نگہت سیما	قیمت 175 روپے
سارے خواب عذاب	لبنیٰ عروج	قیمت 150 روپے
سایہ گل	زاہدہ پروین	قیمت 180 روپے
سوتن کا درد	مہناز عرفان	قیمت 150 روپے